

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

مذکر

{ تاریخ کی روشنی میں }

تالیف

فیلسوف شرق حضرت آیت اللہ سید محمد باقر الصدر رحمۃ اللہ علیہ

فدک

تاریخ کی روشنی میں

تالیف

فیاض شرف حضرت آیتہ اللہ سید محمد باقر الصدر عہد قدس سرہ

پے از مطبوعات

دار الفکر الإسلامية پاکستان

۲- ۵/۴ - ناظم آباد - نمبر ۲ - کراچی

فہرست

	پیش لفظ	■ ■
۱	انقلابی مناظر	●
۱	انقلاب کی مہم نفس زہرا میں	
۵	حالات کی تلخی اور شعور کی پختگی	
۶	انقلابی طاقتیں	
۱۰	راہ انقلاب	
۱۱	فاطمی مظاہرہ کے شرکار	
۱۱	ایک منظر اور اس کا پس منظر	
۱۲	ایک کلمہ آمل و آلام انقلاب کے متعلق	
۱۳	فدک	●
۱۳	فدک تاریخ اسلامی کے ابتدائی دور میں	

- ۱۴ ————— ذک عہد امیر المؤمنین میں
- ۱۵ ————— ذک اور حکومتوں کو عالمی سیاست
- ۱۹ ————— ذک کی مادی اہمیت اور اس کے دلائل
- ۲۱ ————— تاریخ الفتلاب
- ۲۱ ————— تاریخی بحث کے قوانین و قواعد
- ۲۳ ————— صدر اسلام کی عظمت اور جواز تنقید
- ۲۸ ————— عقاد کی کتاب "فاطمہ اور قاطیون" اور ہم
- ۳۲ ————— طرفین کے موقف کی احساسی توجیہ و تعلیل
- ۳۴ ————— انقلاب کا سیاسی رنگ
- ۴۲ ————— حکومت میں جماعتی رنگ آمیزی
- ۵۲ ————— حربہ حاکم کی رفتار آل محمد کے ساتھ
- ۶۳ ————— ذک میں موقف خلیفہ اور طرز مخالفت آل محمد
- ۶۵ ————— امام کا حربہ حاکم سے عظیم مقابلہ
- ۶۸ ————— امام کا سکوت اور احادیث سے احتجاج نہ کرنے کے اسباب
- ۷۸ ————— مطالبہ ذک سیاست علوی کا اعلیٰ ترین کارنامہ ہے
- ۸۰ ————— فاطمی مقابلہ کے مناظر
- ۸۱ ————— فاطمہ کی ناکامی اور کامیابی
- ۸۵ ————— اقتباسات کلام فاطمی
- ۸۵ ————— عظمت پیغمبر روحانی منازل میں
- ۸۸ ————— فاطمی موازنہ امام و اغیار کے درمیان
- ۹۳ ————— اعلان فاطمی سیاست وقت کے متعلق

- ۹۵ ————— نصریح صدیقیہ خلافت ابراہیم اور فتنہ کبریٰ کے متعلق
- ۱۰۷ ————— مقدمہ فدک ●
- ۱۰۷ ————— خلیفہ اپنی رو میں
- ۱۰۹ ————— ہماری بحث اور مرقفہ خلیفہ
- ۱۱۱ ————— روایات خلیفہ اور ہماری تنقید
- ۱۲۵ ————— خلیفہ کا مقصد کیا ہے
- ۱۲۹ ————— خلیفہ سے تصفیہ کا حساب
- ۱۳۲ ————— خلیفہ کی جرح دوسرے مرکز پر



جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب : _____ قدک، تاریخ کی روشنی میں

تالیف : _____ آیہ اللہ سید محمد باقر الصدر شہید

ترجمہ : _____ حجۃ الاسلام سید ذیشان حیدر جوادی

کتابت : _____ سید جعفر صادق

ناشر : _____ دار الشفاۃ الاسلامیہ پاکستان

تاریخ اشاعت : _____ رجب المرجب ۱۴۲۱ھ - اکتوبر ۲۰۰۰ء



پیش لفظ

”فدک“ خیبر کے نزدیک ایک نہایت زرخیز قریہ کا نام ہے جو مدینہ سے تقریباً ۱۴ کلومیٹر کے فاصلہ پر واقع تھا۔ فدک کے باغات نہایت پُر ثمر اور بے حساب دولت و ثروت کے حصول کا ذریعہ تھے۔ ان سے حاصل ہونے والی آمدنی کا اندازہ ان دو تاریخی شواہد سے لگایا جاسکتا ہے:

① خلیفہ اول کے بقول ’پنچیر‘ فدک کی آمدنی سے جنگی اخراجات پورے کرتے تھے۔

② جب فدک معاویہ کے ہاتھ لگا تو اس نے اسے نین ایسی سربر آوردہ شخصیات میں تقسیم کر دیا جن کا مرتبہ اس زمانے میں خلیفہ کے بعد سب سے بڑا تھا یعنی ”مروان ابن حکم“۔ ”عمر ابن عثمان“ اور —————

یزید ابن معاویہ“

فدک سب سے پہلے یہودی ملکیت تھا لیکن اس کے بعد ارضِ اسلامی

قرار پایا۔ فدک کے ارض اسلامی قرار پانے کی تفصیل یہ ہے کہ پیغمبر اسلام نے مدینہ میں حکومت اسلامی کی تشکیل کے فوراً بعد اس نوحیز اسلامی مملکت کے استحکام اور اسے دشمنوں کی فتنہ انگیزیوں سے محفوظ رکھنے کی خاطر مدینہ اور اس کے قریب و جوار میں رہائش پذیر یہودیوں اور غیر مسلم قبائل سے ایک معاہدہ کیا جس کے خاص نکات یہ تھے کہ:

① — اس معاہدہ میں شریک فریقین آپس میں جنگ نہیں کریں گے۔

② — اگر اس معاہدہ میں شریک کسی فریق پر جنگ مسلط کی جائے گی تو دوسرے تمام فریق اس کا دفاع کریں گے۔

فتح خیبر کے بعد پیغمبر اسلام کو خبر ملی کہ فدک کے یہودی آپ سے کیے گئے معاہدہ کی خلاف ورزی پر آمادہ ہو چکے ہیں اور انھوں نے دوسرے مشرکین عرب کے ساتھ مل کر اتحاد قائم کر لیا ہے جو کسی وقت بھی مسلمانوں پر حملہ آور ہو سکتے ہیں۔

پیغمبر اسلام نے اس اطلاع کے ملتے ہی مدینہ کی حفاظت اور انقلاب اسلامی کے استحکام کی خاطر فدک کے یہودیوں سے کیے گئے معاہدہ کو توڑنے اور ان سے جنگ کا اعلان کیا۔

جوں ہی یہود کو پیغمبر کے اس ارادے کا علم ہوا تو اس رعب و دبدبہ اور مہیبت و جلالت کی بنا پر جو مسلمانوں کی طرف سے ان کے دلوں پر طاری تھی انھوں نے رسول کو صلح کی پیشکش کی اور اس کے عوض کے طور پر فدک آپ کی خدمت میں پیش کیا۔



کوئی قطعہ زمین تین طریقوں سے اراضی اسلامی میں شامل ہوتا ہے :

- ① لشکر کشی اور قتال و جہاد کے ذریعہ کوئی زمین مسلمانوں نے فتح کی ہو، یہ زمین شرعی اصطلاح میں مفتوح العنہ (یعنی قدرت و طاقت کے ذریعہ فتح کی گئی زمین) کہلاتی ہے۔
- ② دوسرے ایسا قطعہ زمین جس کے باسی از خود اسلام قبول کر لیں۔
- ③ اور تیسرے وہ قطعہ زمین جس کے باسی نہ ہی مسلمان ہوتے ہیں اور نہ ہی اس زمین پر لشکر کشی اور قتال و جہاد کے ذریعہ مسلمان فتح یاب ہوئے ہوں۔ بلکہ یہ زمین غیر مسلموں نے مصالحت اور جنگ سے بچنے کی خاطر مسلمانوں کے حوالے کر دی ہو۔

شرعیات اسلامی ان تینوں طرح کی اراضی سے منسلق مخصوص قوانین رکھتی ہے۔

وہ زمین جو مسلمان افواج نے جنگ کے ذریعہ فتح کی ہے وہ تمام مسلمانوں کی ملکیت ہے۔ اور ہر مسلمان جس قطعہ اراضی پر آباد ہو گا وہ اس کا حق دار سمجھا جائے گا۔

ایسی زمین جس پر بسنے والے خود اسلام قبول کر لیں وہ انہی نو مسلموں کی ملکیت رہے گی۔

اور ایسی زمین جو ان دونوں صورتوں کے علاوہ حاصل ہوئی ہو یعنی نہ تو جنگ و جہاد کے ذریعہ فتح ہوئی ہو اور نہ ہی اس پر بسنے والوں نے اسلام قبول کیا ہو بلکہ غیر مسلموں نے صلح اور جباں بخشی کی خاطر ایسی زمین مسلمانوں کے حوالے کر دی ہو تو اس قسم کی زمین حکومت اسلامی کے سربراہ کی ملکیت ہوگی۔ اور اس

سربراہ حکومت کو میحق حاصل ہوگا کہ وہ اسے جس طرح چاہے استعمال کرے۔
 فدک چونکہ اسی قسم کی زمین تھی اس بنا پر یہ خاص رسول اکرم کی ملکیت تھا
 جو سنی اور شیعہ روایات کے مطابق آیت: "وَإِنَّ ذَا الْقُرْبَىٰ أَحَقُّهُ وَالْمَسْكِينُ وَابْنُ
 السَّبِيلِ وَلَا تُبْدِي رُءُوسًا" (سورہ بنی اسرائیل ۱۷- آیت ۷۶) کے نزول کے بعد آنحضرتؐ نے
 حضرت فاطمہ الزہراءؑ کو بخش دیا۔^۱

بخشش فدک سے متعلق اہل سنت کے منابع سے معروث صحابی ابو سعید
 خدری سے بھی ایک حدیث منقول ہے کہ: لمانزل قوله تعالى: "وَإِنَّ ذَا الْقُرْبَىٰ
 أَحَقُّهُ"۔ اعطى رسول الله فاطمه فدكاً۔ جب یہ آیت نازل ہوئی کہ "وَإِنَّ ذَا الْقُرْبَىٰ
 أَحَقُّهُ" تو رسول اللہؐ نے فدک کا علاقہ فاطمہؑ کو دے دیا۔^۲

مکن ہے کہ رسول مقبولؐ کے فاطمہؑ کو فدک بخش دینے کی وجوہات کے سلسلہ میں
 مختلف آراء پائی جائیں لیکن یہ امر مسلم ہے کہ فدک فاطمہؑ اور ان کے بعد اولاد فاطمہ کی ملکیت تھا۔
 اور اسے ان سے چھین لینا ایک قبیح اور ناجائز فعل ہے اور حدافسوس کہ بعد وفات رسولؐ حکومت
 اسلامی کے کارپردازوں نے فدک کو دختر رسولؐ سے چھین لیا۔



۲۸ صفر الظفر ۱۱۵۲ بروز سوموار رسول مقبولؐ مجاور رحمت رب میں منتقل ہوئے اور
 بقول حضرت امیر المومنینؑ: "آپ کے فوت ہونے سے نبوت و وحی الہی اور آسمانوں کی خبروں کا رشتہ
 جو کسی بھی مرنے والے کی موت پر قطع نہیں ہوتا قطع ہو گیا ہے" (درنج اہلخانہ خطبہ ۲۲)
 بعد وفات رسولؐ مسقیفہ کی کارروائی کے بعد حزب ماکم نے اہل بیت نبوت کے

۱۔ کشف الغمہ جلد ۲ صفحہ ۱۵۲۔ درمغثور ۳ تالیف جلال الدین سیوطی جلد ۴ صفحہ ۱۷۷
 ۲۔ بزاز، ابو یعلیٰ، ابن ابی حاتم اور ابن مردودہ نے یہ حدیث ابو سعید خدری سے نقل کی ہے (کتاب میزان
 اعتدال ج ۲ صفحہ ۲ اور کنز العمال ج ۲ صفحہ ۱۵۵ نقل از تفسیر نمونہ جلد ۱۳ صفحہ ۱۰۲)

ایک اور حق کے غضب کی جانب قدم بڑھایا اور فدک کو سرکاری ملکیت قرار دے کر اس پر سے فاطمہ الزہراءؑ کے مزار عین کو بے دخل کر دیا۔ فاطمہ الزہراءؑ نے اس غضب کے خلاف دربار خلافت میں صدائے احتجاج بلند کی تو گو کہ آپ کا فدک پر قبضہ خود اس پر آپ ہی کی ملکیت کو ظاہر کرنا تھا لیکن پھر بھی خلیفہ وقت نے آیہ تطہیر کی مصداق خاتون جنت سے اس سلسلہ میں گواہ طلب کیے۔ جب فاطمہ الزہراءؑ نے ام امینؑ اور حضرت علیؑ کو گواہ کے طور پر پیش کیا تو خلیفہ نے ان کو اہوں کو قبول نہ کیا اور اپنے موقف کے حق میں ایک ایسی حدیث پیش کی جس کے راوی بھی تنہا خود ہی تھے اور کہنے لگے کہ پیغمبر نے فرمایا ہے کہ ”ہم کوئی وراثت نہیں چھوڑتے ہم جو چھوڑتے ہیں وہ صدقہ ہے“



حضرت فتمی مرتبتؑ کی فدک حضرت فاطمہ الزہراءؑ کو دینے سے یہ نشانہ تھی کہ حضرت زہراؑ اور آپ کی اولاد اس کے ذریعہ چرپا سائش زندگی بسر کرے اور وہ دنیاوی لذتوں سے لطف اندوز ہوں۔ کیونکہ حیات پیغمبر میں بیشتر واقعات اس نوعیت کے ملتے ہیں جن میں آنحضرتؐ نے اہل بیتؑ کو دنیاوی لذتوں اور آسائشوں سے دور رہنے کی تلقین فرمائی ہے۔

فدک حضرت فاطمہؑ کو بخش کر حضور پر چاہنے تھے کہ میرے بعد حضرت علیؑ کی خلافت مستحکم اقتصادی بنیاد پر استوار ہو اور علیؑ اس مال و دولت کے ذریعہ غریب اور مساکین کی دادرسی کر سکیں اور یوں آپ کی قیادت و رہبری کو تقویت حاصل ہو۔

حزبِ حاکم بھی فدک کی اس اقتصادی اور سیاسی اہمیت سے آگاہ تھی۔ اسی لیے اس نے اس خطرے کے پیش نظر کہہیں علیؑ اس مال و دولت سے استفادہ کر کے سیاسی طور پر مضبوط نہ ہو جائیں اسے فاطمہؑ کے ہاتھوں سے چھین لیا۔

جناب زہراؑ اور حضرت علیؑ کی جانب سے غضبِ فدک پر شدید احتجاج میں بھی سیاسی رنگ غالب تھا اگر شہمی زہراؑ و علیؑ ہیں جو اپنی کل حیات میں دنیاوی لذتوں اور آسائشوں سے کنارہ کشی اختیار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مسئلہ فدک میں بھی آپ کی جدوجہد کسی مادی طمع و لالچ کی

بنایا نہ تھی بلکہ اس کے ذریعہ آپؐ حزبِ حاکم کی بدعنوانیوں کا پردہ چاک کر رہے تھے۔



عامۃ المسلمین نہ ہی خلیفۃ المسلمین کی صلاحیت و اہلیت پر گہری نظر رکھتے تھے اور نہ ہی نااہل حکمران کی وجہ سے دین کی اساس و بنیاد اور شریعت کے اصولوں اور امتِ اسلامی کو لاحق خطرات سے آگاہ تھے۔ بغرض ان کی نظر میں اس بات کی اہمیت نہ تھی کہ زمام اقتدار کس کے ہاتھ میں ہونی چاہیے۔ وہ اس مسئلہ کو نہایت سادہ مسئلہ خیال کرتے تھے ماسی بنا پر انہوں نے خلافت کے غصب پر خاموشی تماشائی لگا کر دارِ اکبر اور مددِ دوسے چند اصحاب کے سوا کسی نے اس غصب پر احتجاج نہ کیا۔

۱۴۰۰ سال گزرنے کے باوجود بھی عوام الناس کی ذہنیت میں کوئی فرق واقع نہیں ہوا ہے اور آج کے دور میں بھی افرادِ امت ایسے ہی لوگوں سے اپنی فلاح و صلاح اور شریعتِ اسلامی کے نفاذ و رواج کی امیدیں باندھے ہوئے ہیں جن کا نہ شریعت سے کوئی واسطہ ہے اور نہ ہی یہ لوگ عوام کی فلاح و بہبود سے کوئی دلچسپی رکھتے ہیں۔ اور ستم بالائے ستم یہ کہ شریعتِ اسلامی کی برملا تضحیک اور لادینیت کا فروغ ان کے جوشِ ایجابی کو ذرہ برابر نہیں بڑھاتا لیکن معمولی مسائل پر یہ اندر اور قوم جوش و جذبات میں آجاتے ہیں۔

حضرت علیؑ امت کی اس ذہنیت سے آگاہ تھے اس بنا پر آپؑ نے اس وقت خاموشی اختیار فرمائی لیکن جیبِ خلیفہِ اول نے فدک پر اپنا ہاتھ صاف کیا تو حضرت علیؑ کو ایک ایسا موقع فراہم ہوا جس کے ذریعہ حزبِ حاکم کے فریب کا پردہ چاک کیا جاسکتا تھا کیونکہ یہ ایک ایسا جرم تھا جس کا قبح سب پر عیاں تھا۔



کتاب ہذا "فدک تاریخ کی روشنی میں" مسئلہ فدک پر حضرت آیت اللہ شہید سید محمد باقر الصدر کی ایک لافانی، اچھوتی اور منفرد تالیف ہے جس میں شہید صدر رضوان اللہ علیہ نے دختر رسولؐ حضرت فاطمہ الزہراءؑ صلوات اللہ علیہ کے موقف کے اثبات کے ساتھ ساتھ اس مسئلہ کی اہمیت اور ان مقاصد و اہداف پر تجزیہ و تحلیل کیا ہے جو مسئلہ فدک کو اس قدر شد و مد سے اٹھانے کے پس پردہ موجود تھے خصوصاً مطالبہ فدک کے پس پردہ موجود سب سے اہم مقصد اہلبیتؑ کے وارث و خلیفہ رسولؐ ہونے اور اس طرح دختر رسولؐ کی جانب سے غصبِ خلافت کو برہا کرنے کے اقدام کو صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔

خداوندِ عالم ہمیں اس کتاب کو پڑھ کر سمجھنے اور اس کے مطابق اپنی ذر واریوں کا تعین کرنے اور ان سے عہدہ برآ ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔

والسلام

"ناشر"



انقلابی مناظر

انقلاب کی مہم نفسِ زمہراہیں

ایک مخدّرہ اس عالم میں کھڑی ہوئی ہے کہ اس کو حالات کا پورا یقین ہے اور سختی موقوف اس کے پیمانہ نصبر کو معمولی خوف و دمہشت سے چھلکا نہیں سکتی اور اس کے حقیقی خیالات میں کسی قسم کا تردد پیدا نہیں ہو سکتا اور قلق و اضطراب کے افکار اس کے راہِ انقلاب میں حائل نہیں ہو سکتے؛

اس لیے کہ یہ مخدّرہ استعدادِ کامل اور ثباتِ قدم کی اس بلندی پر ہے جو اس کو بہرِ سخت اقدام اور دفاعی اسلوب پر جرأت دلا رہی ہے۔ پس مخدّرہ نے اس راستہ کو اختیار کیا ہے جس پر چلنا ایک عورت کے لیے انتہائی دشوار ہے، اس لیے کہ عورت کی طبیعت ضعیف ہوتی ہے اور موقوف انتہائی شدائد و مصائب کا حامل ہے جو ایک ادبی جرأتِ بیانی کا طالب ہے، اور ایک ایسی قدرت چاہتا ہے جس سے انقلابی مفاہیم الفاظ میں ڈھال دیے جائیں اور حالاتِ حاضرہ کی ایسی تنقید کی جائے

کہ جس میں حیات کے مفہیم اور دوام کے خطوط نمایاں ہو جائیں تاکہ ہر حرف ایک مستقل سپاہی اور ہر کلمہ تاریخ عقیدہ کی صحیح سند بن جائے، لیکن ان تمام امور کے باوجود ایمان اور راہِ حق میں اقدامات کا جذبہ عورت کے کمزور نفس میں طبیعت کے خلاف قوتیں پیدا کر رہا ہے اور سست طبیعت میں ایسی طاقت ایجاد کر رہا ہے کہ جس کو کوئی ضعف و تردد روک نہیں سکتا۔

اسی لیے مخدرہ نے اس راستہ کو اختیار کیا جو اس کی طبیعت کے موافق اور حق کی اعانت و نصرت پر کمر بستہ شخصیت کے مناسب ہو۔

اس مخدرہ کے ساتھ اس کے اقربا اور قوم کی کچھ عورتیں اور بھی تھیں، جس طرح بکھرے ہوئے ستارے کہ ان کو یکجا کرنے والا کوئی نہ تھا، لیکن سب اس جذبہٴ دفاع و انتقام میں برابر تھیں۔

اس جماعت کی قائد وہ تمام کلمات اپنے ذہن میں لاری ہے کہ جنہیں عدالت میں پیش کرنا ہے، اور یہ تصور اس کے توت قلب و سکون دل میں برابر اضافہ کر رہا ہے، حق کی طاقت اس کے دل میں بڑھتی جا رہی ہے اور ارادوں کی کنگلی اور پھنے ہوئے حقوق سے دفاع کے جذبات اور سختی موقف سے مقابلہ کے لیے عزائم میں زیادتی پیدا ہوتی جا رہی ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس عورت نے اس سخت وقت میں اپنے مرد و کادل عاریتہ لے لیا ہے تاکہ ان سخت حالات کا مقابلہ کرے اور ان سخت مصائب کا سامنا کرے کہ جن سے پہاڑ ٹکڑے ہو جائیں اور سخت چٹانوں میں زلزلہ پیدا ہو جائے۔ اس ہولناک موقف میں،

یہ مجاہدہ مخدرہ اس شان سے کھڑی ہے کہ حزن و اندوہ کے بادوں اس کے سر پر سپاہِ انگن ہیں۔ اس کے جسم اطہر کا رنگ متغیر، چہرہ پر غضب کے

پھر خیال پٹا اور یہ نظر آیا کہ ،

اب زمانہ دوسرا ہو چکا ہے ، اب وہ گھر کہ جو فانوس نور وحدت
اور رمز نبوت تھا ، جس کی شمعیں عرش سے اتر کر رہی تھیں ، چند جماعتوں کے درمیان گھرا
ہوا ہے اور اس کا وہ ابن عم کہ جو اسلام کی دوسری عظیم شخصیت ہے ،

جو بابِ علمِ نبیؐ ، وزیرِ مخلصِ رسولؐ اور وارثِ رسالت ہے ،
جس کی ابتداء ابتداء رسالت سے متحد تھی ، جو ابتدا میں رسولؐ کا ناصر اور انتہا
میں اس کی امیدوں کی آماجگاہ تھا۔ خلافتِ رسولؐ سے محروم ہو جاتا ہے اور اس کی وہ
فضیلتیں جن کے زمین و آسمان شاہد ہیں ناقابلِ توجہ بنا دی جاتی ہیں اور اس کے وہ اسلامی
کارنامے جن میں وہ یکساں تھا درجہ اعتبار سے ساقط کر دیے جاتے ہیں۔ ان بعض اقدار
کی بنا پر جو اس وقت کی اصطلاح میں ڈھالے گئے تھے۔

اس وقت جبنا عورت کے مقدر میں تھا اس نے گریہ کیا۔ نہ وہ
گریہ جو چہرے سے نمایاں ہو جائے اور سامنے سے جس کا اندازہ کر لیا جائے بلکہ وہ دل کے
شعلے ، نفس کا اضطراب ، قلب کی گہرائی میں حسرتوں کی فراوانی اور نتیجہ میں چشمِ مقدس سے
ٹپکتے ہوئے دو آنسو تھے۔

ابھی کچھ دیر نہ گزری تھی کہ یہ مخدرہ اپنی عجزیوں کو لیے ہوئے
بھڑکتے شعلے کی طرح میدانِ جہاد تک پہنچی اور ایسا قیام کیا جو تاریخ میں دواہی حیثیت
اختیار کر گیا۔ وہ جہاد کیا جس میں عورت کی جہاد امکانی قوتیں صرف کر دیں۔

اور قریب تھا کہ یہ نئے انداز کا جہاد خلافتِ وقت کو تباہ و برباد
کر دے ، اگر وقت کی شدت اور مصائب کی فراوانی حائل نہ ہو جاتی۔

یہ مخدرہ ہیں ————— فاطمہ زہرا صدیقہ کبریٰ بنتِ رسولؐ۔ ریحان
نبوت ، مثالِ عصمت ، شعاعِ نورِ وحدت اور مسلمانوں میں رسولؐ کی امانت کہ جو مسجد

کی طرف اس عالم میں تشریف لے جا رہی ہیں کہ ،
 اپنے ہاتھوں سے ایسا باپ کھوپکی ہیں کہ جو تاریخ انسانیت
 میں محبت و شفقت اور برکت کے اعتبار سے بے مثل و بے نظیر تھا۔
 یہ حادثہ وہ ہے کہ جس سے انسان یا تو تلمیحی موت چکھنے پر
 آمادہ ہو جائے یا پھر موت اس کو انتہائی خوشگوار شیریں اور بہتر نظر آنے لگے۔
 یہ ہیں فاطمہ زہرا کے اس وقت کے حالات جب آپ کے والد نے اس
 دنیا سے رحلت کی اور جوار رحمت الہیہ میں جگہ پائی۔

حالات کی تلخی اور شعور کی سختگی

حوادث انہیں سختیوں تک محدود نہ رہے ، بلکہ فاطمہؑ کو ایک دوسرے
 حادثہ کا بھی سانس کرنا پڑا جس کی تاثیر نفس طاہرہ میں باعتبار حزن و الم و مصیبت و زحمت
 پہلے حادثہ سے قطعاً کم نہ تھی۔

اور وہ یہ کہ خاندان رسالت کی قدیمی شرافت جو ان کے پاس
 ابتدائے تاریخ سے تھی سلب کر لی گئی۔ یعنی سیادت امت اور زعامت ملت کا حق
 علیؑ سے چھین لیا گیا۔

منشاء قدرت یہ تھا کہ آل محمد امت رسولؐ کے ولی ہوں ، اس لیے کہ یہ
 اجرائے رسالت و شہادت ہیں۔ لیکن افسوس کہ حالات زمانہ نے ریاست کا رخ موڑ دیا ،
 اور منصب حکومت کو آل رسولؐ سے چھین کر اپنے خود ساختہ امرائے رؤساء کے حوالہ کر دیا۔
 یہ وہ مصائب تھے کہ جن کی وجہ سے فاطمہؑ اپنی امت سے
 شرافتوں اور ابدی ریاستوں سے محروم ہو گئیں اور اس وقت ان کے مرکز آلام و
 احزان نفس نے انہیں اس اقدام پر آمادہ کیا۔

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ،

اگر فاطمہؑ جیسا کوئی دوسرا انسان اس طرح اس قسم کے مجاہدات اور شجاعتوں کا مظاہرہ کرنا چاہتا تو حکومت کا لقمہ بن کر رہ جاتا۔ اس لیے کہ حالات اتنے ناگفتہ بہ ہو گئے تھے کہ اشاروں پر عقاب، گفتگو پر حساب اور افعال پر عقاب ہو رہا تھا۔ سبلا کس کی مجال تھی کہ اس عالم میں حکومت کے احکام کی خلاف ورزی کرتا۔ پھر وہ احکام جن پر حکومت کی بنیاد اور اس کی اساس قائم ہو۔

ہاں، اگر مجاہدہ بنت رسولؐ، بھینٹہ الیقینیؑ، آسینہ جمال رسالت ہو تو بلا شک وہ بے خطر رہ سکتی ہے۔ زکسی ماوی طاقت کی بنا پر بلکہ اپنی شرافتوں کی بنا پر اور اس لحاظ سے کہ عورت کے ساتھ احکام حکومت میں مراعات کی جاتی ہیں۔

انقلابی طاقتیں

ایک مرتبہ فاطمہؑ اپنے پاکیزہ خیالات کے ساتھ ماضی کی طرف متوجہ ہوتی ہیں اور باپ کا وہ زمانہ یاد کرتی ہیں، جو کہ ان کے انتقال کے بعد فاطمہؑ کے ذہن میں بطور یادگار محفوظ رہ گیا ہے، جو ہر وقت فاطمہؑ کے نفس میں ایک نیا شعور اور تازہ احساس پیدا کر رہا ہے۔ جس سے فاطمہؑ ہر وقت ایک نئی مسرت و لذت حاصل کرتی ہیں۔ فاطمہؑ اگرچہ روز و شب کے اعتبار سے باپ سے دور ہو گئی ہیں لیکن خیالات و افکار کی وجہ سے باپ کے زمانہ سے ہمیشہ متحد ہیں۔ فاطمہؑ کے پہلو میں قدرت کا سرچشمہ ہے جو خشک نہیں ہو سکتا۔ انقلابی طاقتیں ہیں جو کم نہیں ہو سکتیں۔ نبوتِ محمدؐ کی شفاعتیں ہیں جو رہنمائی

کر رہی ہیں۔

جب فاطمہ نے دل میں انقلاب کی ٹھان لی اور ایک مرتبہ اپنے احساسات کا سہارا لے کر ماضی کی طرف متوجہ ہوئیں تاکہ اس سخت وقت میں اپنے باپ کے تذکروں سے مدد حاصل کریں تو ایک مرتبہ فاطمہ نے زبانِ حال سے آواز دی:

ایک نظر اس طرف، اے صورتِ سعادت!
فاطمہ تجھ سے جدا ہو کر ایک ایسی شقاوت میں مبتلا ہو گئی ہے کہ
جو ناقابلِ برداشت ہے،

اے عزیز ترین و محبوب ترین روح! مجھ سے باتیں کر اور اپنے
نورِ الہی کا فیضان کر، جیسے کہ تو سابقاً کیا کرتی تھی۔

اے پدرِ بزرگوار! اگر آپ کو میری باتیں اچھی معلوم ہوں تو
میں آپ سے باتیں کروں، میں اپنے غم و اندوہ کو پر اگندہ کرنا چاہتی ہوں، جیسا کہ
آپ کے سامنے کیا کرتی تھی، میں آپ کو بتانا چاہتی ہوں کہ آپ کا سایہ رحمت جو مجھے
آتش و نیا سے بچاتا تھا اب باقی نہیں رہا۔

اے بابا! آپ کے بعد وہ مصائب گزرے کہ اگر
آپ موجود ہوتے تو شاید اتنے مصائب ہم پر نہ پڑتے۔

اے ماضی کے تذکرہ!

ہمارے سامنے اپنی باتیں دہراؤ تاکہ میں ان میں سے ایک
جنگ کی بنیاد رکھوں، ایسی جنگ کہ جس میں کوئی سستی نہ آنے پائے۔

ان لوگوں کے خلاف جو از خود یا بخواہش مردم میرے باپ کے
منبر پر قابض ہو گئے ہیں اور حقوقِ آلِ محمدؐ کا خیال نہیں کرتے بلکہ بہت عصمت کو تباہ کرنے
پر آمادہ ہیں۔ مجھے میرے باپ کی جنگیں یاد دلاؤ۔ کیا میرے باپ مجھ سے بیان نہیں کرتے تھے

کہ میرا سبھائی میدان کا مرد، اور جہاد کا سپاہی،
 تمام ساتھیوں سے بہتر، ایسے سخت وقت میں جب سب
 میدان چھوڑ کر چلے جائیں، ثابت قدم رہنے والا ہے۔
 اے ماضی حبیب!

کیا اس کے بعد ممکن ہے کہ میں دیکھوں کہ علیؑ زیرِ منبر ہوں
 اور ابو بکرؓ بالائے منبر، لاواللہ!

مجھے بتادے اے میرے باپ کے زمانے!

کیا یہ ابو بکر وہی نہیں ہے کہ جس پر سورہ برأت کی تبلیغ کے
 سلسلے میں وحی الہی نے اعتماد نہ کیا تھا۔ کیا اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ علیؑ ہی وہ
 اسلامی نمائندہ ہے کہ جس پر پیرِ اسلامی ہم میں اعتماد ہونا چاہیے۔

مجھے باقاعدہ وہ زمانہ یاد ہے جب میرے باپ جنگ کے
 لیے تشریف لے گئے تھے اور علیؑ کو اپنا نائب بنا دیا تھا۔ تو لوگوں نے اس پر بڑی بڑی
 باتیں کیں۔ لیکن علیؑ مثل کوہ ثابت قدم رہے اور آپ نے کوئی توجہ نہ کی۔

میں نے چاہا کہ علیؑ، پیغمبرؐ سے اس کی شکایت کریں۔ یہاں تک
 کہ انھوں نے رسولؐ سے جا کر بیان کیا اور اس حالت میں پلٹے کہ ان کے چہرے سے
 آثارِ مسرت ہوید اٹھے اور کمالِ مسرت سے میرے پاس آکر ایک آسمانی بشارت دی
 اور بیان کیا کہ رسولؐ نے استقبالِ عظیم کے بعد مجھے بمنزلہ ہارون قرار دیا۔
 اے زمانے!

ہارونِ موسیٰؑ تو شریکِ حکومت و امامتِ امت ہوں!

۱۔ حدیثِ منزلت صحیح بخاری و مسلم و خصائص نسائی و مستدرک حاکم و جامع ترمذی و مرئج الذهب
 مسعودی وغیرہ میں موجود ہے۔ ریاض النفرہ ۲۵ ص ۱۱۱

لیکن اردو بن محمد ان مناصب سے محروم کر دیا جائے یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔
اب تصوراتِ فاطمہؑ لپکا ر اٹھے۔

یہی وہ انقلاب ہے جس کی خبر قرآن نے دی ہے
اے اصحابِ محمدؐ! رسولؐ کے بعد دینِ جاہلیت کی طرف پلٹ
نہ جانا۔ یقیناً یہی وہ لوگ ہیں جو دین سے گریزاں ہیں۔ ان پر
مجہولِ منقن نے غلبہ کر لیا ہے۔ اسی لیے سقیفہ میں ایک فریق
نے اپنی کثرت و عزت کو پیش کیا اور دوسرے نے اپنی قربت
کو، اور قرآن و سنت کو درجیہ اعتبار سے سنا نظر کر دیا۔

پھر آواز دی :

اے قوانینِ محمدؐ! کہ جو میری رگ و پے میں خون کی طرح دوڑ
رہے ہیں، یہ وہی ہے کہ جس نے مکہ میں آپؐ پر ہجوم کیا اور آج ہم اہل بیتؑ کے
دروازے پر آگ جلا رہا ہے۔

اے ریحِ مادری!

جہادِ اسلامی کا وہ درس جو آپؐ نے مجھے دیا ہے، ناقابلِ فراموش
ہے۔ آپؐ نے بابا کے شانہ بشانہ جہاد کیا، میں بھی آپؐ کے نقشِ قدم پر ہوں۔
لیک! لیک! اے مادرِ گرامی! میرے دل کی گہرائیوں میں
آپؐ کی آوازیں ہیں جو مجھے حکامِ دقت کے مقابلہ پر آمادہ کر رہی ہیں۔
مادرِ گرامی!

میں عنقریب ابو بکر سے جا کر کہوں گی کہ تم نے بابا پر بیتان باندھا ہے
میں تو دنیا سے چلی جاؤں گی لیکن قیامت میں تم سے ملاقات کروں گی، اس عالم میں کہ
حاکم اللہ ہوگا، رئیسِ وزعمیرا آپؐ ہوگا۔ موقوف قیامت کا ہوگا میں چاہتی ہوں کہ مسلمانوں کو

ان کے انجام سے آگاہ کر دوں اور انہیں وہ سیاہ مستقبل دکھا دوں جو کہ انہوں نے اپنے ہاتھوں سے آریک بنایا ہے۔

میری تمنا ہے کہ

میں ان سے کہہ دوں کہ تم نے خلافت کو دودھ کی خاطر عالم بنایا ہے، لیکن عنقریب یہ دودھ، خون کی شکل اختیار کر لے گا۔ اس میں اہل باطل گھائے ہیں رہیں گے اور سابقین کے نقش قدم پر چلنے والے پہچان لیں گے کہ ان کی بنیاد کیسی تھی۔

فاطمہؑ میدانِ عمل کی طرف چلیں، اس عالم میں کہ ان کے دل میں محمدی قرآین، علوی شجاعت، خدیجہ کی رومانیت اور امت کی شفقت و ہدایت کا جذبہ تھا۔

راہِ انقلاب

کھلی ہوئی بات ہے کہ وہ راہ جو فاطمہؑ نے انقلاب کے لیے طے کی کچھ طولانی نہ تھی۔ اس لیے کہ جس گھر سے انقلابی شرارے اٹھے تھے وہ علیؑ کا گھر تھا جس کو اصطلاحِ رسولؐ میں بیت النبوة کہا جاتا تھا۔

اور یہ گھر مسجد کے عسایر میں تھا۔

مسجد اور دروازہ سیدہ میں ایک قدم کا فاصلہ تھا۔ اس طرح کہ مسجد اور گھر کے درمیان ایک دیوار سے زائد کا فاصلہ نہ تھا۔

اس مقام پر دو احتمال ہیں۔

یا فاطمہؑ اس دروازہ سے داخل ہوئیں جو مسجد کے اندر تھا یا پھر صدر دروازہ سے۔ اگرچہ یہ زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ شہزادیؑ صدر دروازہ سے آئی ہوں، جیسا کہ سیاقِ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے کہ خصوصی دروازہ سے آنے میں مسجد سے ابوبکرؓ تک جانے میں کوئی دیر نہ لگتی اور نہ چلنے کی ضرورت تھی حالانکہ راویؑ فاطمہؑ

کی رفتار کی توصیف کرتا ہے کہ سفیرِ اسلام کی رفتار سے ذرا بھی مختلف نہ تھی۔ اگر یہ کہا جائے کہ توصیف اس چال کی ہے جو ابوبکر تک پہنچنے میں دیکھی تھی تو خلافتِ عربیت ہوگا اس لیے کہ مسجد میں قدم رکھنا ہی ابوبکر کے سلسلے جانے کے مرادف ہے۔ بہر حال قرآن سے اندازہ ہوتا ہے کہ فاطمہ صدر دروازہ سے داخل ہوئیں۔

فاطمی منظرِ ہرہ کے شکار

روایت بتلاتی ہے کہ فاطمہ کے ساتھ کچھ ہم قوم و قرابت عورتیں بھی تھیں۔ اس اجتماع اور صدر دروازہ سے جانے کا مقصد صرف ایک تھا اور وہ لوگوں کو متوجہ کرنا، اور ان کے انکساف کو اس امر کی طرف مبذول کرنا کہ وہ مسجد میں جمع ہو کر یہ دیکھیں کہ فاطمہ کا مقصد کیا ہے اور نسبت رسولؐ کیا کہنا چاہتی ہے، تاکہ طرفین کے درمیان مقدمہ علی الاعلان ہو اور دنیا حق و باطل میں آسانی امتیاز پیدا کر سکے۔

ایک منظر اور اس کا پس منظر

روایت نے یہ بتایا کہ فاطمہؑ پیغمبر کی رفتار سے مسجد میں تشریف لائیں ضرورت اس بات کی ہے کہ اس فلسفہ کو واضح کیا جائے۔

اس میں ایک احتمال تو یہ ہے کہ یہ فاطمہ کی عادت رہی ہو، اس لیے کہ یہ بیٹی جملہ افعال و اقوال میں باپ سے مشابہ تھی۔

اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ فاطمہ نے قصداً یہ رفتار اختیار کی ہو اور یہ چاہا ہو کہ عوام کے خیالات اور جمہور کے احساسات کا رخ ماضی قریب کی طرف موڑ دیا تاکہ وہ اس دور کو یاد کریں جب اسی مہندہ کے باپ کے سایہ رحمت میں چین کی زندگی

بسر کر رہے تھے اور یہی احساس و شعور وہ ہے کہ جو فاطمہؑ کے بیان کی تہید ہو جائے گا اور لوگوں کو دعوتِ فاطمہؑ کے قبول کرنے پر آمادہ کرے گا اور فاطمہؑ کو ان کے اقدامات میں کامیاب بنائے گا۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ،

قلبِ راوی متاثر ہوا اور اس نے شعوری یا لاشعوری طور پر جملہ تاریخی وقائع کے ساتھ فاطمہؑ کی رفتار کا تذکرہ بھی کر دیا۔

ایک کلہ آمالِ آلام انقلاب کے متعلق

یہ ایک فاطمی فریاد تھی جس کو مسلمانوں نے سنا اور اب یہی آواز حقیقت مند بوجہ اور اقدامِ یلوس کامرکز بن گئی جس کے بعد کچھ چہروں پر امیدوں کی مسکراہٹ نظر آئی لیکن آہستہ آہستہ یہ مسکراہٹ بجائے تہقہہ کے سسکیوں میں بدل گئی اور مسلمانوں کو دائمی یلوسی کا سامنا کرنا پڑا۔

یہ وہ انقلاب تھا جس سے انقلاب کرنے والی منحدرہ کا مقصد کچھ نہ تھا۔ سوائے اس کے کہ یہ انقلاب تاریخ کے صفحات پر ثبت ہو جائے اور دنیا پر حق و باطل نمایاں ہو جائیں۔ اس اعتبار سے یہ انقلاب انتہائی کامیابی کے ساتھ ختم ہوا۔ اگرچہ نگاہِ اداری اسے ناکام سمجھی۔

اس کی کامرانی کی ضمانت آئندہ آئے گی۔



فدک

فدک تاریخ اسلامی کے ابتدائی دور میں

فدک، مدینہ سے دو یا تین دن کے فاصلہ پر حجاز کا ایک قریب ہے۔ ابتدائے تاریخ سے یہ یہودیوں کی زمین تھی۔ چنانچہ مکہ تک یہودی اس پر قابض رہے۔ مکہ میں ان لوگوں نے خوفِ رسولِ اسلام سے نصرت یا پورے فدک کا رسولؐ سے مصالحو کر لیا۔

اس دن سے فدک کی اسلامی تاریخ کا آغاز ہوا اور یہ ملک خاص رسولِ اسلام بنا۔ اس لیے کہ مسلمانوں نے یہاں کوئی جنگ نہ کی تھی۔

پیغمبرؐ نے یہ زمین فاطمہؓ کے حوالہ کر دی۔ وقتِ وفاتِ نبی اکرمؐ تک فدک انھیں کے ہاتھوں میں رہا۔ اس کے بعد بقول ابن حجر خلیفہ نے اسے فاطمہؓ سے چھین لیا اور اس کو اہم مصداقِ مدینہ، عمدۃ ثروتِ دولتِ اسلامیہ قرار دے دیا۔ یہاں تک کہ

خلافتِ عمر کو ملے، انھوں نے فدک و ارضانِ رسولؐ کو دے دیا اور یہ زمانہ عثمانؓ تک ان کے قبضہ میں رہا۔ عثمان نے اسے مروان بن الحکم کو بخش دیا۔ اس کے بعد تاریخِ خاموش ہو جاتی ہے۔
لیکن اتنا بہر حال ثابت ہے کہ علیؑ نے مروان سے فدک بھی جلا مروال
تعارف شدہ بنی امیہ کی طرح چھین لیا۔

فدک کے عہدِ امیر المومنینؑ میں

خلیفہ وقت کے بعض حمایت کنندگان کا خیال ہے کہ فدک علیؑ کے زمانہ میں بھی شیخین ہی کی طرح استعمال ہوتا رہا۔ اور دلیل یہ ہے اس امر کی کہ فدک علیؑ کی نظر میں حقِ خاصِ فاطمہؑ نہیں تھا۔
میں اس وقت تقیہ کی بحث چھیڑ کر امیر المومنینؑ کی سیرت کی توجیہ نہیں کرنا
چاہتا، بلکہ میں اس بات سے انکار کرتا ہوں کہ
علیؑ نے فدک میں سیرتِ صدیق پر عمل کیا ہو۔

اس لیے کہ تاریخ میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ علیؑ فدک
کو اولادِ فاطمہؑ کا حقِ خاص ضرور سمجھتے تھے۔ جیسا کہ آپ نے اس کا اظہار عثمان بن صفیہ
کے مکتوب میں فرمایا ہے۔

بنا بریں ممکن ہے کہ آپ ماصلاتِ فدک صرف اولادِ فاطمہؑ پر صرف کرتے

نے اس بیان کی ذمہ داری اہل تاریخ پر ہے (مؤلف)

اس بیان سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابو بکر کی پیشین کردہ حدیثِ سخنِ معاشر
الانشیاء... پر حضرت عمر کو بھی اکتفا نہیں تھا۔ ورنہ ہاں سلیمن کو و ارضانِ رسولؐ کے حوالے نہ کرتے
یہ اور بات ہے کہ کل آپ ہی نے فدک نہ بیچے پر سارا زور صرف کو لیا تھا۔ چراکارے کند عاقل کہ باز آید پیمان و ترجم

سپے ہوں اور اس امر کی تاریخی شہرت بھی ضروری نہیں ہے۔ اس لیے کہ مال مالک حقیقی ہی کے ہاتھ میں تھا۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ آپ غلاتِ فدک کو مصالحِ مسلمین میں صرف کرتے رہے ہوں لیکن وارثانِ فاطمہؑ کی اجازت سے۔
جیسا کہ ایک احتمال یہ ہے کہ اولادِ فاطمہؑ نے فدک کو وقف کر کے صدقہ عامہ قرار دے دیا ہو۔

فدک اور حکومتوں کی عالمی سیاست

اس کے بعد جب معاویہ حاکم بنا تو اس نے حقِ مغضوب کا اور بھی استخفاف کیا اور ایک ثلثِ فدک مروان بن الحکم اور دوسرا عمر بن عثمان اور تیسرا ثلث اپنے بیٹے یزید کو دے دیا۔ یہ لوگ اس پر متصرف رہے، یہاں تک کہ تمام فدک مروان کے ہاتھ لگ گیا۔

اس کے بعد عمر بن عبدالعزیز بن مروان قابض ہوئے۔ انھوں نے فدک اولادِ فاطمہؑ کو واپس کر دیا۔ اور والی مدینہ ابو بکر بن عمر بن حزم کو خط لکھا کہ یہ اولادِ فاطمہؑ کو دے دیا جائے۔ اس نے جواب دیا۔ فاطمہؑ کی اولاد آلِ عثمان اور آلِ فلاں و آلِ فلاں بھی ہیں۔ میں کسے دوں؟

اس نے پھر لکھا کہ اگر میں تجھے کسی گائے کے ذبح کرنے کا حکم دیتا تو تو اس کا رنگ پوچھتا۔ لہذا اب میرا خط پاتے ہی فوراً اسے اولادِ فاطمہؑ پر تقسیم کر دے جو

سے یہ احتمال زیادہ قوی ہے کہ اگر صرف اولادِ فاطمہؑ پر صرف ہوتا تو دوسرے لوگوں کے دینے کا کیا مطلب ہے جیسا کہ مگنوب ابن حنیف میں ہے یا اگر وقف ہوتا تو پھر اولادِ فاطمہؑ کے لیے واپس لینا کیونکر جائز ہوتا۔

کہ علیؑ کی اولاد میں ہوں۔

بنی امیہ نے اس بات سے عمر بن عبدالعزیز پر سخت اعتراض کیا اور کہا کہ تم نے شیخین کی توہین کی۔

بعض کا خیال ہے کہ عمرو بن قیس ایک جماعت اہل کوفہ کے ساتھ اس کے پاس گیا اور سخت عتاب کیا۔ اس نے کہا:

تم جاہل ہو اور میں عالم۔ تم بھول گئے اور میں نے یاد رکھا ہے۔
ابوبکر بن محمد بن عمرو بن حزم نے اپنے باپ سے انھوں نے اپنے جد سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا تھا کہ:

فاطمہؑ میری پارہ جگر ہے جس نے اسے ناخوش کیا

اس نے مجھے ناراض کیا اور جس نے اسے خوش کیا اس نے مجھے

رامنی کیا۔

یاد رکھو! فدک عہد ابوبکر و عمر میں ان کے پاس تھا۔ اس کے بعد مروان کے ہاتھ لگا، اس نے میرے باپ عبدالعزیز کو دیا۔ اب ہم اس کے وارث ہوئے۔ کچھ حصے ہمارے بھائیوں نے ہمیں ہبہ کر دیئے کچھ ہمارے ہاتھ فروخت کر دیئے، اب جب تنہا ہماری ملک ہے تو ہم جسے چاہیں دے دیں۔ تمہیں حق اعتراض نہیں۔

وہ بولے، اگر ایسا ہی ہے تو اصل فدک رکھ لو، اس کا سناقع ان پر تقسیم

کر دو۔ چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا۔

اس کے بعد یزید بن عبدالملک نے فدک اولادِ فاطمہؑ سے چھین لیا اور وہ

اولاد مروان میں ان کے خاتمہ تک رہا۔

جیب ابو العباس سفاح خلیفہ بنا تو اس نے فدک عبداللہ بن الحسن بن

الحسن بن علی بن ابی طالبؑ کو پلا دیا۔ ابو جعفر منصور نے زمانہ حکومت میں بنی حسن سے

اور محمد بن الحسن بن علی بن علی بن الحسین بن علی بن ابی طالب کو دے دیے جائیں۔ یہ دونوں امیر کی طرف سے ولی امر ہیں۔ اس رائے کو بخوبی سمجھ لے۔ اس امر کے لیے خدائی اہلام اور توفیق غیبی ہے جس سے امیر کو تقرب خدا اور رسول حاصل ہوگا۔ اب تجھے چاہیے کہ محمد بن یحییٰ اور محمد بن عبد اللہ کے ساتھ وہی سلوک کرے جو مبارک طبری کے ساتھ کرتا تھا۔ بلکہ تجھے ان دونوں کی اعانت کرنی چاہیے تاکہ غلات میں اصنانہ ہو اور قریبہ باقاعدہ آبار ہو سکے۔

فقظ والسلام

جب منوکل کی بیعت کی گئی تو اس نے فدک کو فاطمین سے چھین لیا اور اس کو عبد اللہ بن عمر یا زیاد کے حوالہ کر دیا۔ اس باغ میں ۱۱ خرہ کے وہ درخت تھے جنہیں خود رسول اکرم نے لگایا تھا۔ عبد اللہ بن عمر نے ایک شخص کو مدینہ بھیجا جس کا نام بشر بن ابی اسیہ ثقفی تھا۔ اس نے وہاں پہنچ کر تمام درخت کاٹ ڈالے۔ جب پلٹ کر آیا تو مفلوج ہو گیا۔ فاطمین کا فدک سے آخری تعلق چند منوکل تک رہا۔ اس کے بعد یہ ابن عمر یا زیاد کے ہاتھوں میں پہنچ گیا۔

یہ فدک کی ایک مختصر داستان پریشان ہے جو کسی ایک قاعدہ و قانون پر درست نہیں ہو سکتی۔ بلکہ یہ داستان خواہشات ہوا و ہوس کی پیداوار ہے کہ جو سیاست و وقت کے اعتبار سے بدلتی رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ فدک بالکل خالی از عدل و انصاف بھی نہیں اس لیے کہ کبھی یہ مال اپنے مالک تک بھی پہنچا ہے۔ اتنا ضرور معلوم ہے کہ اجتماع اسلامی میں

لے ان تفصیلات کو حسب ذیل کتب میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

فتوح البلدان ۳۹۰-۴۱۰، تاریخ یعقوبی ۳، عقد فرید ۳۲۳، مہم البلدان ۶، ص ۴، تاریخ ابن کثیر ۴، شرح ابن ابی الحدید ۳، تاریخ الخلفاء ۱۵۳، حجرتہ رسائل العرب ۳، ص ۵۱، اعلام السائر ۳، ص ۱۲ (مترجم)

فدک نے بڑی اہمیت پیدا کر لی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس مشکل کا ہر عہد میں نیا حل پیدا کیا گیا۔ اور ہر شخص نے اہل بیتؑ سے اپنے تعلق کے اعتبار سے اس میں تصرف کیا۔ اگر حاکم کی رائے مستدل و مستقیم رہی تو اس نے فدک اس کے وارثِ اصلی کو واپس کر دیا اور اگر عقل و رائے میں فتور پیدا ہو گیا تو غضبِ فدک یا دشاہِ وقت کا پہلا کا زامہ قرار پایا۔

نظرِ اسلامی میں فدک کی قیمت معنویہ کا اندازہ وکیلِ خزاعی کے اس قصیدہ سے ہوتا ہے جو انھوں نے مامون کے ردِ فدک کے وقت نظم کیا تھا جس کا مفہوم یہ ہے:

”آج زمانے کے چہرہ پر تہسم کی لہریں دوڑ رہی ہیں اس

یہ کہ مامون نے فدک کو اس کے حقیقی مالک کے ہاتھوں میں

دے دیا ہے۔“

فدک کی مادی اہمیت اور اس کے دلائل

اس مقام پر یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ فدک کسی معمولی زمین یا باغ کا نام نہیں ہے جیسا کہ بعض کا خیال ہے۔ بلکہ یہ بلاغوتِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ فدک کے اموال سے ایک ثروتِ عہد کی تشکیل ہو سکتی تھی۔ البتہ اس کی ضرورت نہیں ہے کہ میں اس کی سالانہ آمدنی کا حساب کروں، اگرچہ بعض روایات میں اس کی بڑی مقدار بیان کی گئی ہے۔ فدک کی مادی قیمت پر چند امور دلائل کرتے ہیں:

① — عمر نے ابو بکرؓ کو فدک کی واپسی سے یہ کہہ کر منع کیا کہ اگر فدک

نکل گیا تو اسلام کی آمدنی کم ہو جائے گی حالانکہ جہادِ مرتدین

عاصمین کے لیے اس وقت بڑی ثروت کی ضرورت ہے۔ یہ

کھلی ہوئی بات ہے کہ وہ زمین جس کے حاصلات سے حکومت کا

مسیار بلند کیا جاسکے اور سخت اوقات میں فوجوں کی تشکیل دی جاسکے۔ وہ کوئی معمولی باغ نہ ہوگا۔

② خلیفہ وقت نے صدیقہ طاہرہؓ سے گفتگو کے دوران میں یہ کہا تھا کہ مالی خاص بنی اکرم نہیں ہے بلکہ مال مسلمانوں کے لئے ہے۔ پیغمبرؐ لشکر سازی کیا کرتے تھے اور اسے راہِ خدا میں صرف کیا کرتے تھے۔ اہل انصاف بتائیں کیا یہ کام معمولی زمین سے لیا جاسکتا ہے؟

③ تاریخ شاہد ہے کہ معاویہ نے فذک کو تین حصوں پر تقسیم کر دیا تھا۔ واضح بات ہے کہ معمولی زمین کی آمدنی تین بڑے سرپرداروں پر تقسیم نہیں کی جاسکتی۔

④ معجم البلدان نے فذک کو قریب سے تعبیر کیا ہے اور ابن ابی الحدید نے اس کے درختانِ خرم کو کو فذک کے چھٹی صدی ہجری کے خرموں کے برابر تحریر کیا ہے۔



تاریخ انقلاب

تاریخی بحث کے قوانین و قواعد

اگر نتیجہ خیز تر فکری حیات اور با معنی منطقی بحث کے لیے ذاتی عقائد سے تجرد، سنجیدگی حکم، اور حریت فکر ضروری اشیاء میں تو پھر اس بات کے کارناموں کی تاریخی بنیاد قائم کرنے کے لیے بھی ان اشیاء کی اشد ضرورت ہوگی تاکہ ان کی حیات کے وہ خدو و خال نمایاں ہو سکیں کہ جو تاریخ کی ملکیت بن کر رہ گئے ہیں اور ان کی شخصیت کے وہ عناصر سامنے آسکیں جو ان میں تھے یا جنہیں زمانہ نے ان میں محسوس کیا اور اس طرح گزشتہ ادوار کے لیے انسان فکر و تامل کا میدان وسیع ہو سکے۔

اور یوں انسان اس بات کی حیات کو دینی، اخلاقی اور سیاسی سیار پر پرکھ سکے، بشرطیکہ اس تامل و فکر کا منبع انسان کا واقعی معاشرہ ہونے کی ذاتی عقائد و خیالات اور آبائی تقلید و تعبد، کہ اس طرح انسان چند اوہام پر تحقیق کی پوری عمارت قائم کر دیتا ہے جس کا دوام چند ساعت کے لیے بھی نہیں ہوتا۔

لیکن اگر ہم تاریخ پر گہری نظر ڈالیں، نہ اس لیے کہ ہم واقعات کا مطالعہ

کریں اور نہ اس لیے کہ اپنی بحث کو چند علمی قواعد میں محدود کر دیں اور نہ اس لیے کہ ہر واقعہ کے مفروضات و احتمالات کو جمع کر کے ان کی تصحیح و تنسیط کریں بلکہ اس لیے کہ ہم اسلاف کے کارناموں سے اپنے احساسات و جذبات کو زندہ کریں تو اس حالت میں یہ ان لوگوں کی تاریخ نہ ہوگی جو روئے زمین پر چند خاص احساسات و تصورات کے ساتھ زندہ رہے اور اچھے یا برے کردار کو پیش کر کے دنیا سے اٹھ گئے۔

بلکہ یہ ان شخصیتوں کی سوانح نگاری ہوگی کہ جنہوں نے ہمارے اذہان میں زندگی کی ہے اور جن کے خیالات نے ہمیں افکار کی انتہائی پسندیدوں تک پہنچا دیا ہے۔

پس اگر کوئی شخص چاہتا ہے کہ فکری آزادی حاصل کرے اور دنیا کی تاریخ مرتب کرے، نہ روایاتی حیثیت سے کہ جو ذہن میں آئے اسے تحریر کر دے بلکہ حقیقت بیانی کے لحاظ سے، تو اسے چاہیے کہ اپنے ذاتی عقائد کو الگ کر دے اور اگر یہ ممکن نہیں ہے تو کم از کم تاریخی بحثوں سے ان کو الگ رکھے۔ اس لیے کہ عقائد انسان کی ذاتی ملکیت میں انہیں کوئی سلب نہیں کر سکتا۔

حقیقت بیانی خود اس امر کی طالب ہے کہ امانت و دیانت سے کام لیا جائے اور تاریخ انسانیت صحیح فکر کے ساتھ نتیجہ خیز انداز سے مرتب کی جائے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ذاتی عقائد مورخین کو نقد و نظر سے روک دیتے ہیں چنانچہ مورخین کل یا اکثر کی یہ عادت ہو گئی ہے کہ وہ واقعات چند خاص قواعد کے ساتھ لکھ دیتے ہیں اور اس طرح حقائق وہ شکل اختیار کر لیتے ہیں کہ ان میں وقتی حسن نظر آنے لگتا ہے لیکن حقیقتاً ان وقائع کو دنیا نے انسانیت کے نشاط و ارتقا سے کوئی لگاؤ نہیں ہوتا۔

عقرب ہم ان باتوں کے شواہد اس عصر کے حالات سے پیش کریں گے کہ جو

تاریخ اسلام کا انتہائی پر آشوب دور ہے اور وہ بعد وفات نبیؐ کا وہ زمانہ ہے کہ جس وقت اسلام کا بنیادی مسئلہ ایک ایسی شکل میں حل ہو رہا تھا کہ جو ناقابلِ تغیر و تبدیل ہو یعنی مسئلہ خلافت و ریاست امورِ مسلمین۔

صد اسلام کی عظمت اور حجازِ منقید

ہر مسلمان کی خواہش ہے کہ عصرِ اول کی تاریخ انتہائی پاکیزہ ہو۔ اس میں حیاتِ انسان کے ساتھ شر و فساد کا اختلاط نہ ہو سکے۔ اس لیے کہ اس دور میں خیر کے نمونے بجزرت موجود تھے۔

اس دور کا موجد ایک انسان اکبر تھا جس نے حیاتِ انسانیت کے منفی پہلوؤں کو اجاگر کر دیا اور جس کے دور میں عقیدہ الوہیت اس منزل تک پہنچ گیا تھا جہاں تک فلاسفہ انبیاء کے طائرِ اولیٰم پر نہیں مار سکتے تھے۔

جب نبی اکرمؐ کا روحانی عکس عصرِ اول پر پڑا تو اسے پیغمبری سانچے میں ڈھلنا ہی چاہیے تھا۔ چنانچہ محمدین کی ایک جماعت تو اس طرح اس سانچے میں ڈھل گئی کہ ان کے اذہان میں سوائے تصور رسالت اور کوئی خیال ہی نہ رہا۔

وہی ان کے وجود کا مدار اور وہی ان کا استاد اکبر تھا، جس نے اپنی ذات کو الوہیت میں اس طرح فنا کر دیا تھا کہ وقت نزول وحی، سوائے صوتِ الہی کوئی آواز نہ سنتا تھا۔ اس کی نظر میں چار دانگ عالم میں سوائے جلوہ وحدت اور کچھ نہ تھا۔

وہ زمانہ جب مادی امتیازات کے موازین لغو قرار دے دیے گئے ہوں اور قانون کی نظر میں حاکم و محکوم برابر ہو گئے ہوں، جب کہ معیار، قیمتِ معنوی اور مدارِ کرامت، تقویٰ الہی کو قرار دے دیا گیا ہو، جس سے ارواح کی پاکیزگی اور خیر کی حفاظت ہوتی ہو جو نفسِ انسان کو آفاقِ عالیہ تک پہنچا دے، جس کے توازن میں غنی کا احترام

بوجہ سراپہ اور فقیر کی توہین بوجہ غربت حرام ہو۔ جس نے انسان کو بقدر عمل اہمیت دی ہو۔

”لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا كُتِبَتْ“

وہ زمانہ تھا جس میں انسانیت کی فلاح کے لیے جہاد ہو رہے تھے تاکہ شخصی شرافتوں کو لغت بردار دیا جائے اور دنیاوی کرامتوں کو حساب سے ساقط کر دیا جائے۔

میر خیال ہے کہ وہ زمانہ جوان مفاخر و کرامات کا مجمع ہو حقیقتاً اس امر کا مستحق تھا کہ اس کی تقدیریں اور اس کا احترام کیا جاتا۔

لیکن افسوس کہ مجھے کوئی طاقت اس امر پر مجبور کر رہی ہے کہ ایک ایسے موضوع کو وسعت دوں جو مجھ سے متعلق نہیں ہے۔ بہر حال میں اپنے موضوع کا خیال رکھتے ہوئے چاہتا ہوں کہ مختصر حالات اس زمانہ کے متعلق بیان کر دوں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ زمانہ روحانیت اور نورانیت کے اعتبار سے قابل فخر تھا۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اس کا باقاعدہ مطالعہ نہ کیا جائے اور اس زمانہ کے کسی مسئلہ پر صحیح طریقہ سے بحث و تمحیص نہ کی جائے۔

یہ یہ نہ کہا جائے کہ مسئلہ فدک میں ایک نہ ایک خطا پر ضرور تھا۔ یا یہ رائے نہ قائم کی جائے کہ خلافتِ مسقیفہ وقتی چارہ جوئی کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ قدیمی سازش کا اثر ہے۔ خواہ تاریخ ان تمام باتوں کا ثبوت ہی کیوں نہ پیش کر دے۔ لا واللہ۔

ایک جماعت کا خیال ہے کہ گزشتہ زمانہ یعنی ابو بکر و عمر اور ان کے ایشال کے کارناموں پر تنقیدی نظر نہیں ڈالنی چاہیے۔ اس لیے کہ یہ لوگ حیاتِ اسلامیہ کے ذمہ دار اور اسلامی سنہری شاہراہوں کے بانی تھے۔ ان کی تاریخ پر کسی قسم کا اعتراض کرنا اسلامی تاریخ کو بدنامانا ہے اور اس دورے متعلق مسلمانوں کے

جذبات کو ٹھیس لگانا ہے۔

میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ ایک مختصر کلمہ کہہ دوں کہ جو ایک طویل بحث کی بنیاد ہے۔ اس لیے کہ اس مسئلہ کو طویل دینا ہمارے موضوع سے خارج ہے۔

میں ان موضوعین سے صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ یہ اسلامی وقار یا عصرِ اول کی تو رائیت، یہ صدر اسلام کی روحانیت کیا صرف ابو بکر و عمر کے وجود کا نتیجہ ہے؟ کیا ان کو ان روحانیتوں میں کوئی دخلیت حاصل ہے؟
اس کا تفصیلی حل تو طوالت طلب ہے۔

البتہ مختصر یہ ہے کہ اس عصر کی تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ اس وقت مسلمانوں میں دینی حمایت اور عقیدہ پر لڑنے کا جذبہ آخری منزل پر تھا۔ یہاں تک کہ تاریخ بیان کرتی ہے کہ ایک روز عمر نے منبر پر پوچھ لیا کہ اگر ہم معروٹ کو منکر بنا دیں تو تم کیا کرو گے؟

ایک شخص بول اٹھا:

”ہم تم کو توبہ کا حکم دیں گے۔ اگر توبہ کرو گے تو قبول کر لی جائے گی۔“
عمر نے کہا: ”اگر نہ کریں تو؟“

وہ بولا: ”تمہاری گردن ارٹا دیں گے۔“

عمر نے کہا: ”شکر ہے اس معبود کا کہ جس نے امت میں ایسے افراد پیدا کر دیے جو ہماری غلطیوں کی اصلاح کر سکتے ہیں۔“

میں اس جذبہ کا واضح ثبوت وہ واقعہ ہے کہ جب حضرت عمر نے برسر منبر عورتوں کے مہر کی حد بندی کی۔ اور ایک عورت نے اٹھ کر ٹوک دیا اور اس طرح یہ ثابت کر دیا کہ عورتیں بھی احکام الہیہ سے واقف ہوتی ہیں اور انہیں بھی خلیفۃ المسالین کی اصلاح کرنے کا حق حاصل ہے۔

یہ بھی یقینی امر ہے کہ حزب اختلاف یعنی اصحابِ علیؑ، خلافتِ وقت کی پوری نگرانی کر رہے تھے کہ اگر کوئی بات جادۂ حق سے منحرف واقع ہو تو خلافت کا تختہ الٹ کر رکھ دیں، جیسا انجام کہ عثمان کا ہوا۔ جب انھوں نے مظالم شروع کر دیے۔ حالانکہ اب لوگ برائیت زمانہ شیخیوں کے کافی سست پڑ چکے تھے۔

ان باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخیوں ایک ایسے زمانہ میں تھے کہ جس میں توہینِ سیاست میں اگر کوئی تغیر کرنا چاہتا تو مشکل تھا، اس لیے کہ نظرِ اسلامی ان کی باقاعدہ نگرانی کر رہی تھی اور مسلمان اس وقت تک اسلام سے کافی خلوص رکھتے تھے اور ان میں حکومت کا کافی شوق تھا اور یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ اگر اسلام میں کوئی واضح تغیر پیدا کر دیا تو حزبِ مخالفت جو کہ پیغمبری سانچے میں ڈھلا ہوا ہے اور جس کا راسخا وارثِ رسولؐ وصیٰ پیغمبرؐ ولی المؤمنین علیؑ ہے مقابلہ کے لیے کھڑا ہو جائے گا۔

اگرچہ فتوحاتِ اسلامیہ کو اس دور کے وقائع میں بطور سرخی نقل کیا جاتا ہے لیکن یہ ہر شخص جانتا ہے کہ اس کو حکومتِ وقت سے کوئی تعلق نہیں۔ اس لیے کہ ہر جنگِ مجاہدین امت کی طبعی شرائطوں کا پتہ دیتی ہے اور میدانِ جہاد سے صرف مجاہدین کی شخصیت کی تاریخ مرتب کی جاتی ہے نہ کہ اس حاکم کی جس تک آتشِ جنگ کی چنگاری تک نہیں پہنچی اور جس کی کوئی مستقل رائے اس سلسلہ میں نہ تھی۔

اس لیے کہ خلیفہ وقت نے خواہ جنگِ شام میں ہو یا عراق میں یا مصر میں، کسی وقت بھی کوئی کلام اپنی شخصی طمانت یا اپنی حکومت کے زور پر زبان سے نہیں نکالا کہ اس کلمے کو اہمیت دی جاسکے بلکہ ہمیشہ کلماتِ رسالت کی قوت کا اعلان کیا جس میں قطعی وعدہ تھا کہ بلا کر کسریٰ و قیصر فتح ہوں گے۔

اس کلامِ نبی کریمؐ سے مسلمانوں کی امیدیں بڑھ گئیں اور ان میں جوشِ ایمانی پیدا ہو گیا۔

تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ بہت سے وہ لوگ جو بعد رسولؐ خانہ نشین ہو گئے تھے وہ گھر سے نہیں نکلے جب تک یہ نہ سن لیا کہ پیغمبرؐ نے فتح بلاد کسریٰ و قیصر کی خبر دی ہے بس یہی خیر رسولؐ اور قوتِ ایمانی تھی جو مسلمانوں کو میدانِ جنگ میں روکے ہوئے تھی۔ اس کے علاوہ ایک بات اور تھی جس نے مسلمانوں کو کامیاب بنایا اور ان کو ہر موکد جہاد میں مظفر و منصور قرار دیا جس کا کوئی تعلق حکومتِ شوریٰ و عیسوی سے نہیں ہے اور وہ رسولؐ کا وہ اعلانِ توحید تھا جو آفاق میں گونج رہا تھا۔

مسلمان دیکھ رہے تھے کہ ہم جس ملک میں مادی قوت لے کر جاتے ہیں وہاں ایک روحانی لشکر بھی ساتھ ساتھ رہتا ہے اور یہ بات بہت انزالی کے لیے بہترین وسیلہ ہے۔

ان فتوحات میں حاکمین کا فریضہ علیٰ یہ تھا کہ مسلمانوں کے ملک کو فتح کرنے کے بعد ان میں اسلامی روح بھونکیں، ان کے سامنے قرآنِ منور پیش کریں، ان کے دل کی گہرائیوں میں دینی دندہ ہی شعور اتار دیں۔

لیکن میں نہیں کہہ سکتا کہ ان حکام نے اپنے اس فریضہ کو کس طرح انجام دیا۔ اب مورخین مجھے بتائیں کہ میں اس سلسلے میں کوئی منظر پیش کروں یا پھر بعض موضوعین کی طرح پورا پورا شک کروں جیسا کہ تاریخ بھی گواہی دیتی ہے۔

دو فوں غلامتوں میں حالات ایسے تھے کہ نتیجہ خیر لشکری زندگی

کی بنیاد ڈالتے اور سیاسی زندگی کی صحیح تعبیر کرتے؟

پھر میں نہیں سمجھ سکتا کہ یہ لوگ کیا کرنے اگر علیؑ کی جگہ پر ہوتے اور علیؑ کو وہ دور مل جاتا جب کہ جملہ حالات تھی حکومت اور جدید سیاست تازہ زندگی

لے قوتِ ایمانی اور ثباتِ قدم کے اسی ارتباط و اتحاد کو جناب امیرؑ نے میدانِ جنگ میں

اُکھتر بعد الایمان کہہ کر واضح کیا تھا۔ (مترجم)

اور لطفِ حیات کے لیے سازگار تھے۔ کیا یہ لوگ حالات کو اس طرح بدل سکتے تھے جیسے علیؑ نے زمانہ کو بدل کر اخلاص و عمل کی ایک مثال قائم کر دی۔
 میں یہ نہیں کہتا کہ شیخین اچھی سیرت اختیار کرنے پر مجبور تھے اور اعتدالِ حکومت ان کے لیے اضطراری امر تھا بلکہ میرا مقصد تو یہ ہے کہ حالات انھیں ان امور پر سختی سے آمادہ کر رہے تھے خواہ وہ خود راغب ہوں یا نہ ہوں۔

میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ ان کے نام کو تاریخِ اسلامی سے علیحدہ کر دوں۔ بھلا یہ کیونکر ہو سکتا ہے جبکہ سقیفہ کی اسلامی تاریخ کی بنیاد انھیں سے پڑی ہے۔ میں تو صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اسلامی وقارِ دینی و حاکمیت جو کہ صدرِ اول میں تھی اس میں ان کا ہاتھ برائے نام تھا۔

عقاد کی کتاب "فاطمہ و فاطمیوں" اور ہم

اس وقت میرے پیش نظر عباس محمود عقاد کی کتاب "فاطمہ و فاطمیوں" ہے۔ میں نے اس کتاب کو بڑے شوق سے کھولا ہے۔ تاکہ اس موضوع پر ان کی رائے کا مطالعہ کر لوں۔ اس وقت میرے ذہن میں یہ بات ہے کہ باپ دادا کی تقلید اور ان کے غلط کارناموں کی تاویل کا زمانہ گزر گیا ہے۔ اب وہ دور نہیں رہا جب مسائلِ انسانیت (خواہ وہ دینی ہوں یا تاریخی) میں غور و خوض کرنے سے پرہیز کیا جاتا تھا، کہ جس پر سب کی ابتدا خلیفہٴ اول سے ہوئی جب کہ ان سے مسئلہٴ قدر کے متعلق پوچھا گیا۔ تو انھوں نے مسائل کو تہدید و تحولیت شروع کر دی۔

بنا بریں میری دل امید تھی کہ

استاد موصوف کی کتاب سے اس بحث میں بہت کچھ لطیف

مطالب حاصل ہوں گے۔ لیکن افسوس کہ واقعہ اس کے خلاف نکلا اور کتاب میں اس

موضوع کے متعلق صرف چند سطر میں نکلیں، جن کو میں بعینہ نقل کر سکتا ہوں۔ جن کا
ماحصل یہ ہے :

”مسئلہ فدک کی بحث ان ابجاث میں سے ہے
کہ جو کسی متفق علیہ نتیجہ تک نہیں پہنچ سکتی۔ لیکن حقیقت
یہ ہے کہ صدیقہ کسی ایسے امر کا مطالبہ نہیں کر سکتی جو اس کا
حق نہ ہو اور صدیق بھی کسی کے حق کو روک نہیں سکتے اگر
بعینہ قائم ہو جائے۔“

یہ خیال انتہائی غیر مناسب ہے کہ ابو بکر نے فدک
لے لیا تاکہ علیؑ اس کے حاصلات کو اپنی خلافت کے لیے زعفران
کریں۔ اس لیے کہ ابوبکر و عمر و عثمان و علیؑ سب نے حکومت
کی لیکن آج تک یہ نہیں سنا گیا کہ کسی نے دولت دے کر
بیعت حاصل کی ہو۔ اس امر کا ذکر کسی بھی خبر و روایت میں نہیں
ملا۔ میری نظر میں صدیق کے عہد میں فدک سے بہتر پاکیزہ فیصلہ
کسی مقدمہ میں نہیں ہوا۔ اس لیے کہ وہ فاطمہؑ کو فدک دے کر
خوش کر سکتے تھے اور انھیں کی رضائے صحابہ بھی خوش ہو جاتے
لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا، اس لیے کہ ایک فیصلہ کی
ذمہ داری تھی جس کی بنا پر وہ اسس قضیہ میں اس قدر
مجبور ہو گئے۔ ورنہ یہ سب صادق و مصدق رضوان اللہ
علیہم اجمعین تھے۔“

اس مقام پر سب سے نمایاں بات یہ ہے کہ استاد عقاد
کی خواہش ہے کہ مسئلہ فدک ان مسائل میں سے قرار دیں جنہیں کوئی قرار نہیں اور جن

ہیں کوئی فیصلہ غیر ممکن ہے تاکہ یہ بات کوتاہی بحث کا اندر بن سکے۔
اس کا جواب تو آئندہ معلوم ہو جائے گا۔ اس وقت تو صرف یہ بتانا ہے
کہ اگر بحث فزک کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتی تو پھر یہ دونوں قابل انکار حقیقتیں کہاں
سے پیدا ہو گئیں۔

ایک یہ کہ صدیقہ ناحق مطالبہ نہ کریں گی،
اور دوسرے یہ کہ صدیق کسی کا حق نہ ماریں گے۔
اور اگر صحابہ کے کردار پر کوئی بحث نہیں ہو سکتی تو بے قرار بحث اور بے نتیجہ
نزاع شروع سے کیوں اٹھالی گئی۔

میری رائے ہے کہ مصنف کو ہر موضوع میں اپنی آزاد رائے پیش کرنے کا
حق ہے، بشرطیکہ اس پر کوئی دلیل رکھتا ہو۔ اور بحث کے تمام اطراف پر حاوی ہو تاکہ کسی
ایک طرف کو اختیار نہ سکے۔

لیکن اس کا کوئی مطلب نہیں ہے کہ مسئلہ کو محل بحث تو قرار دیا جائے
لیکن جبرائے پیش کی جائے وہ دلیل سے بالکل بے گانہ ہو۔ جو خود ہی محتاج شرح و تفسیر و
غور و خوض ہو۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر خاطر نا محق مطالبہ نہ کریں گی تو پھر مطالبہ بتینہ کیسا؟
کیا اسلامی قوانین قاضی کو اپنے علم کی بنا پر فیصلے سے روک دیتے ہیں؟
اگر ایسا ہے تو کیا پھر کسی کے مال کا چھین لینا بھی اسلام میں اسی بنیاد پر جائز

لے اسلامی قانون قصاوت میں یہ مسئلہ اختلاfi ہے کہ آیا قاضی اپنے ذاتی علم کی بنا پر فیصلہ
کر سکتا ہے یا نہیں۔ لیکن ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ اگر قاضی اس امر کو ناجائز بھی قرار دے دیں تو
میں حضرت ابو بکر کو نبیلہ کر دینا چاہیے تھا۔ ان میں اور دیگر قاضیوں میں تفرقہ کی تفصیل
آئندہ واضح کی جائے گی۔ (مترجم)

ہو جاتا ہے۔

یہ چند سوالات ہیں۔ اس کے علاوہ اور بھی سوالات ذہن میں پیدا ہوتے ہیں جو علمی جواب کے طالب ہیں۔

ہیں چونکہ حریتِ فکر کا قائل ہوں اس لیے میں استاد عقدا کو تینا چاہتا ہوں کہ صدیق و صدیقہ دونوں کے کردار کی اصلاح غیر ممکن ہے۔ اس لیے کہ اگر یہ نزاع صرف اس بات پر ہوئی کہ صدیقہ باغ کا مطالبہ کریں اور صدیق منع کر دیں تو کہہ دیا جاتا کہ حقیقت میں فاطمہ صدیقہ ہیں لیکن مدرک شرعی کے مہیا نہ ہونے پر صدیق ان کو فدک دینے سے مجبور ہو گئے اس لیے کہ ممکن ہے کہ انسان کا واقعی حق نظامِ تصدقات کے قواعد کی بنا پر اسے نہ مل سکے۔

لیکن ان سوس کی بات صرف اتنی نہیں بلکہ خصوصیت نے مختلف شکلیں پیدا کیں۔ یہاں تک کہ صدیقہ نے صراحتاً ابو بکر کو متہم کیا اور ان سے بے تعلقی کا عہد کر لیا۔

اس وقت ہمارے سامنے دو باتیں ہیں۔

ایک یہ کہ ہم اعتراف کر لیں کہ صدیقہ نے ایسے حق کا مطالبہ کیا کہ جو نظامِ شرعی اور تصدقاتِ اسلامی کی رو سے انھیں نہ ملنا چاہیے تھا اگرچہ واقعاً وہ انھیں کا تھا۔

دوسرے یہ کہ اس کی ذمہ داری ابو بکر پر ڈال دیں کہ انھوں نے فاطمہ کا واجب الادا حق نہیں دیا۔ (ان دونوں باتوں کا فرق آئندہ واضح ہوگا) پس یہ کہنا کہ فاطمہ حدودِ شرعیہ کے خلاف مطالبہ نہ کریں گی اور ابو بکر کسی کا حق نہ ماریں گے۔ ناقابلِ اجتماع باتیں ہیں۔ جب تک کہ اجتماعِ ضدین ممکن نہ ہو جائے۔ یہاں پر ایک دوسرا اعتراض یہ پیدا ہوتا ہے کہ استاد عقدا نے فاطمہ

کے خلاف فیصلہ کو خلیفہ کے ثبات قدم اور عدالت و استقامت کی دلیل قرار دیا
اس لیے کہ اگر وہ فدک فاطمہؑ کو دے دیتے تو وہ بھی خوش
ہو جائیں اور صحابہ بھی خوش ہو جاتے۔

ہم نے مانا کہ حدود قانون اسلامی فدک کو صدقہ قرار دینے
پر مجبور کر رہے تھے، تو کیا یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ اپنے اور اصحاب کے حصہ سے کچھ نبت
رسولؐ کو دے دیا جاتا جبکہ صحابہ اس سے خوش تھے۔ بقول عقاد کیا قانون اسلام
میں یہ بھی حرام تھا؟

یا کسی کا اشارہ تھا کہ فاطمہؑ کی اولاد بھڑکی رہے۔ بلکہ وہ کون سا قانون تھا
جو فدک دینے سے مانع تھا۔ جبکہ فاطمہؑ نے وعدہ کر لیا تھا کہ اس کے حاصلات کو مصالح
مسلمین ہی پر صرف کریں گی۔ رہ گیا یہ مسئلہ کہ اگر فدک علیؑ کو ملتا تو وہ اس سے حکومت
چلاتے جس کو عقاد نے وہم و خیال تصور کیا ہے تو اس کا تجزیہ ہم بعد میں کریں گے کہ آیا یہ
خیال کہاں تک صحیح ہے۔

طرفین کے موقف کی احساسی توجیہ و تعلیل

جب یہ معلوم ہو گیا کہ لوگوں کے ذاتی عقائد آسمانی وحی نہیں ہیں کہ ہونا قابل
شک و انکار ہوں اور اسلاف کے کارناموں کی تنقید کفر و الحاد نہیں ہے جیسا کہ ایک
جماعت کا خیال ہے تو پھر ہمیں یہ پوچھنے کا حق ہے کہ فاطمہؑ کو کس شے نے آمادہ کیا تھا کہ ایسی
سمجھتی کے ساتھ فدک کا مطالبہ کریں کہ گویا حکومت وقت اور سلطنت حاضرہ کی جلالت ان
کی نظر میں کچھ ہے ہی نہیں کہ جو اس کے مظالم کی پردہ پوشی کرے بلکہ فیصلہ استانیایاں
ہو جائے کہ کوئی پردہ اس کو چھپا نہ سکے۔

بلکہ اس نزاع کی ابتدا اور اس کے مراحل تو یہ بتاتے ہیں کہ یہ نزاع

آج تک سنبھلے سنبھلے چہیتے ایک انقلاب کی شکل اختیار کرنے کی جس میں کسی صنعت و ترود کی گنجائش نہ ہوگی۔

عجب نہیں کہ حکومت وقت بلکہ خود خلیفہ کا یہ مقصد رہا ہو کہ فاطمہ زہرا کے ساتھ دوزنگی چال چلی جائے۔ لیکن یہ ان کے دل میں نہ آیا کہ اس طرح تاریخ میں ان کی بدعنوانی کا ایک باب تیار ہو جائے گا جس میں ان کے اور اہلبیت رسالت کے جھگڑے نقل کیے جائیں گے تو پھر خلیفہ وقت اس تاریخی باب کے موافق تھے کہ وہ فاطمہ کے خلائق اس جرأت و مہمت کا مظاہرہ کر رہے تھے۔

یا وہ واقعا قوانین تضاد کے پابند تھے اور حدود اللہ سے تجاوز کو جائز نہ جانتے تھے جیسا کہ بعض کا خیال ہے یا اس موقع عجیب کو موقع سقیفہ سے بھی کوئی ارتباط حاصل ہے، ایسا اتحاد و ارتباط کہ جو دو مختلف چیزوں میں مقصد کی یکسانیت اور غرض کی یکسانیت کی بنا پر ہوتا ہے۔

تحریک فاطمیہ کا دور یہ بتاتا ہے کہ وہ اہل بیت، وہ اہل رسول تاکہ جو اپنے عمید اکبر کے انتقال سے محزون و رنجیدہ تھے، حالات سے اس قدر متاثر ہو گئے تھے کہ وہ حالات حاضرہ کو بدلنے اور ان کو نئے سانچے میں ڈھالنے کی اشد ضرورت محسوس کر رہے تھے اور اتفاقاً فاطمہ زہرا کے لیے انقلاب کے جہاں مکانات اور مقابلہ کی تمام قوتیں ہبیا ہو گئی تھیں۔

جب ہم تاریخی وقائع کا بغور مطالعہ کرتے ہیں تو؛

ہیں یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ یہ نزاع اپنے واقعہ کے اعتبار سے حکومت وقت کے خلاف ایک انقلاب کی کوشش تھی۔ چونکہ اس نے اصول شریعت بدل کے رکھ دیے تھے۔ اس کا حقیقی تعلق ایک مالی سیاست سے نہیں ہے۔ اگرچہ اس کی ابتدا اقتصادی مسئلہ ہی سے ہوئی تھی۔ صرف یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ دنیا حکومت

وقت کی 'دین نبی کریم سے بے تعلقی کا بغور مطالعہ کر لے۔
 اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ انقلابِ فاطمی کی اصل معلوم کریں تو ہمارا فرضِ اولیٰ ہے
 کہ واقعہ کا بغور مطالعہ کریں تاکہ ہم پر تاریخِ اسلام کے دو واقعے جو ایک دوسرے کا عکس و
 اثر تھے واضح ہو جائیں۔

ان دونوں وقائع کا رشتہ درحقیقت ایک تھا جو کہ تھوڑے فاصلہ
 سے متحد ہو جاتا تھا۔

ان وقائع میں سے ایک فاطمی اقدام تھا کہ جس کی اہمیت
 یہ تھی کہ قریب تھا کہ ارکانِ حکومت کو متزلزل کر دے اور خلافتِ اولیٰ کو
 تاریخ میں مہلات کی جگہ دے دے۔

اور دوسرا عائشہ کا اقدام جس نے یہ چاہا تھا کہ زوجِ قبولِ علی بن
 ابی طالب کی حکومت کی بنیادوں کو ہلاکے بمقدور ایسا تھا کہ دونوں اقدامات ناکام ہو
 لیکن ناکامیوں میں ذرا سا فرق تھا جو اقدام کرنے والے کی طبیعتِ رضامندی سے وابستہ
 تھا اور اس کے اطمینانِ نفس اور جذبہٴ نصرتِ حق کا پتہ دے رہا تھا۔
 فاطمہ ناکام ہوئیں لیکن اس عالم میں کہ خلیفہٴ رورور کہہ رہے
 تھے کہ مجھے خلافت سے مستعفی کرو۔

اور عائشہ ناکام ہوئیں اس عالم میں کہ وہ تمنا کرتی تھیں:
 "کاش! گھر سے باہر نہ نکلتی اور مسلمانوں میں انشقاق
 نہ پیدا کرتی۔"

یہ دونوں وہ انقلابات ہیں جو مومنوع اور شخص کے اعتبار سے بہت
 قریب قریب ہیں تو پھر ایسا کیوں نہیں ہے کہ ان کے محرکات اور اسباب بھی
 ایک جیسے ہوں۔

ہم تجویز واقف ہیں کہ وہ سبب انقلاب جس نے عائشہ کو گھر سے نکال دیا تھا اس وقت جبکہ انھوں نے خلافتِ علیؑ کی خبر پائی ان اوقات میں پیدا ہوا تھا جب حیاتِ نبوی کریمؐ میں زوجہ رسولؐ اور بنتِ رسولؐ کے مقابلے چل رہے تھے۔

اس مقابلہ کا انجام یہی ہونا تھا کہ اس میں وسعت پیدا ہو اور شکست خوردہ طرف کے دل میں غیظ و نفرت کے احساسات پیدا ہو جائیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ اس دائرہ میں وسعت پیدا ہو گئی۔

ایک طرف اس طرح کہ عائشہ نے علیؑ کے خلاف مہم چلا دی اور دوسری طرف ایسی وسعت پیدا ہوئی جس میں اس شخصیت کو کبھی لے لیا گیا کہ جس کی وجہ سے بیتِ النبیؐ میں علیؑ سے عداوت چل رہی تھی۔

سچ تو یہ ہے کہ عائشہ کے انقلاب کی مہم اس وقت سے شروع ہو گئی تھی جب قصہٴ انک میں علیؑ نے پیغمبر کو طلاق کا مشورہ دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ بات ایک عورت کو کس قدر متاثر کر سکتی ہے۔ جبکہ وہ پہلے سے اس کی زوجہ کی مخالفت بھی ہو۔ نتیجہ یہ ہوا کہ زوجہ رسولؐ اور بضعتہ النبیؑ کے درمیان نزاع اس حد تک بڑھی کہ اس میں علیؑ وغیر علیؑ کو بھی داخل کر لیا گیا۔

ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ

حالاتِ خلیفہٴ اول کو فاطمہؑ کی خاص نگرانی کی طرف متوجہ کر رہے تھے۔ مزید برآں یہ کہ جب خلیفہٴ اول نے فاطمہؑ سے عقد کا پیغام دیا تھا تو اسے پیغمبرؐ نے رد کر دیا تھا۔ حالانکہ علیؑ کے پیغام کو قبول کر لیا تھا۔

ظاہر ہے کہ یہ رد و قبول بھی ایک ایسے انسان میں کہ جس کے پہلو میں دل ہو اور دل میں احساس، ایک غیظ یا حسد کا مادہ ضرور پیدا کر دے گا۔ اور اس طرح شکست خوردہ انسان میں ایک مقابلہ کا جذبہ پیدا ہو جائے گا۔

یہ بھی قابل توجہ امر ہے کہ رسولؐ نے ابو بکر کو سورہ برأت دے کر بھیجا تا کہ کفار کو سنائیں اور اس کے بعد علیؑ کو بھیج کر نصف راہ سے واپس لے لیا۔ صرف اس بنا پر کہ فاطمہؑ کے بارے میں علیؑ سے مقابلہ کرنے والا اپنی استعداد ایمانی کا اندازہ کر لے۔

یہ بھی طبعی بات ہے کہ خلیفہ اس مقابلہ کو دیکھ کر بھی متاثر ہو رہے ہوں گے کہ جو فاطمہؑ اور عائشہ کے درمیان پیغمبر اکرمؐ کی محبت کے سلسلے میں چل رہا تھا۔ جیسا کہ ایک باپ کا بیٹی کے متعلق خیال ہوتا ہے اور عجب نہیں کہ جس وقت مرض الموت نبی اکرمؐ میں عائشہ نے اپنے باپ کو نماز کے لیے بھیج دیا اور پھر خود پیغمبرؐ نے آکر ان کو معزول کر دیا، خلیفہ نے یہ خیال کیا ہو کہ یہ تحریک بھی فاطمہؑ کی ہے۔ انھوں نے میری امامت کو باطل کرنے کے لیے اپنے باپ کو بسیرِ علامت سے اٹھا کر مسجد کی طرف روانہ کر دیا ہے۔

تاریخ سے یہ قطعی امید نہیں ہو سکتی کہ وہ واقعات کو مفصل و مبسوط طریقہ پر بیان کرے۔

البتہ جو بات کہ یقینی معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ جس شخص پر ایسے ناکام حالات گزر چکے ہوں اس کا فطری تقاضا یہ ہے کہ فدک میں فاطمہؑ کے مقابلہ میں سختی سے قیام کرے۔

اور وہ عورت جو فاطمہ زہراؑ کی طرح سے مصائب اٹھائے، یہاں تک کہ صبح و شام مخالف کی بیٹی کے حسد سے نجات نہ پاسکے، یقیناً اس امر کی مستحق ہے کہ وہ اس وقت خاموش زرہ ہے کہ جب لوگ اس کے حق شرمی پر قابض ہو رہے ہوں۔



انقلاب کا سیاسی رنگ

یہ ہے تاریخ انقلابِ فاطمی جس میں مختلف پہلوؤں کا سیاسی نظر آتے ہیں لیکن واضح ترین سیاست کا ہے جس کا اندازہ الطوار و اسالیب انقلاب سے ہوتا ہے۔

اس بات سے میری مراد وہ مفہوم نہیں ہے جو آجکل رائج ہے جس کی بنیاد جعل و فریب پر ہوتی ہے۔ بلکہ میرا مقصود وہ حقیقی مفہوم ہے جس میں انزوار کی گنجائش نہیں ہے لہذا اگر کوئی شخص اس نزاع کے اشکال و اطوار کا مطالعہ کرے تو فوراً یہ خیال کرے گا کہ

اتنا بڑا اقدام ایک زمین کے مطالبہ کے لیے نہیں ہو سکتا بلکہ درپردہ کوئی اس سے بڑی مہم ہے جو انقلاب پر آمادہ کر رہی ہے، اس خاتون کو مجبور کر رہی ہے کہ وہ اپنی گئی ہوئی حکومت اور لٹے ہوئے تخت و تاج کو واپس لے لے۔ بنا بریں فدک ایک رمزی لفظ ہے جس سے بڑے اہم معنی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اور اس سے مراد حجاز کا خطہ ارضی نہیں ہے اور یہی فدک کی رمزیت تھی جس کا دائرہ وسیع ہوتا گیا، یہاں تک کہ وسیع میدانِ جنگ قائم ہو گیا۔ آپ جس طرح چاہیں تاریخِ فدک کے حقائق کا مطالعہ کریں لیکن مجھے بتادیں کہ یہ ایک مادی جھگڑا تھا۔۔۔؟

کیا یہ فدک کے محدود معنی میں نزاع ہو رہی تھی۔۔۔؟

کیا یہ ایک مختصر زمین کے غلات کا مقابلہ تھا۔۔۔؟

ہرگز نہیں، طرفین نزاع کی شان اس سے اجل و ارفع ہے کہ ایسی نزاع قائم کریں بلکہ درحقیقت یہ اقدام اساس حکومت کے خلاف تھا، جس سے فاطمہؑ نے چاہا تھا کہ خلافت کی ان بنیادوں کو ہلا کر مچھینک دیں جو ان کے شوہر

کے خلاف روزِ سقیفہ قائم کی گئی تھیں۔

اس امر کے اثبات کے لیے وہ خطبہ کافی ہے جو کہ فاطمہ زہراؑ نے مسجدِ رسولؐ میں خلیفہ کے سامنے پڑھا تھا جس وقت مسجدِ انصار و ہاجرین سے چھلک رہی تھی۔ اس خطبہ میں پہلے زہراؑ نے علیؑ کی مدح کی اور ان کی جنگوں کا تذکرہ کیا، حقوقِ اہلبیت رسالت بیان کیے کہ یہی مخلوقات کا وسیلہ ہیں، یہی حجِ اشد اور ورثہٴ انبیاء ہیں۔

اس طرح فاطمہؑ نے لوگوں کو ان کی خطا، ان کے فوری انتخاب کی کمزوری اور ان کو ان کی بے دینی کی طرف متوجہ کر دیا اور وہ اسباب بیان کر دیے کہ جن کی وجہ سے امت نے موضوعِ خلافت و امامت میں کتاب و سنت کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ اب معلوم ہو گیا کہ یہ مسئلہ میراث و عطیہ نہیں ہے مگر اس مقدمہ تک کہ جہاں تک اس کا تعلق حکومت و امت سے ہے۔ اور یہ مطالبہ کسی جائیداد کا نہیں ہے بلکہ زہراؑ کی نگاہ میں یہ اسلام و کفر، ایمان و نفاق اور رض و اجساع کا مسئلہ ہے۔

یہی بلند سیاست اس گفتگو میں بھی نظر آتی ہے جو فاطمہؑ نے انصار و ہاجرین کی عورتوں سے کی تھی۔
آپ نے فرمایا:

لوگوں نے ارکانِ رسالت، قواعدِ نبوت، مالکِ دنیا و دین کو چھوڑ کر خلافت نہ جانے کن لوگوں میں ڈال دی
بھلا کون ساعیبِ علیؑ میں انھوں نے پایا۔ ہاں! یہ علیؑ کی
تلوار، ان کے اقدامات، ان کے مجاہدات اور راہِ خدا میں
ان کی قربانیوں سے نالاں ہیں۔

اس کے بعد فرماتی ہیں :

ان لوگوں نے پست اقوام کو بلند لوگوں پر مقدم کر دیا ہے اور یہ خیال کرتے ہیں کہ ان کا یہ عمل اچھا ہے۔ یاد رکھو! یہ لوگ فساد برپا کرتے ہیں اور انھیں خود شہور نہیں ہوتا۔ حیثیت یہ اتنا بھی نہیں سوچتے کہ ہدایت یافتہ انسان زیادہ مستحق اتباع ہوتا ہے یا وہ شخص جو خود ہی محتاج ہدایت ہو۔ نہایت ہی بدترین یہ فیصلہ ہے۔

ازواج رسولؐ سے کہیں نہیں نقل کیا گیا کہ انھوں نے بھی میراث کا مطالبہ کیا ہو۔ کیا یہ کہا جائے کہ یہ عورتیں فاطمہ زہراؑ سے زیادہ تارک دنیا تھیں؟ یا یہ تصور کیا جائے کہ یہ مذاق شریعت رسولؐ سے زیادہ واقف تھیں؟ یا یہ خیال کیا جائے کہ یہ مصیبت پیغمبرؐ میں مشغول ہو گئیں اور فاطمہؑ متوجہ نہیں ہوئیں۔ یا پھر یہ مان لیا جائے کہ حکومت وقت نے حالات میں تفرقہ پیدا کر دیا۔ انھوں نے ازواج کو مطالبہ کا موقع ہی نہیں دیا اور فاطمہؑ کو اس امر پر مجبور کر دیا کہ وہ شدید معاوضہ اور سخت مقابلہ کر میں جو تاریخ میں ابدی یادگار بن جائے۔

میراث تو یہ خیال ہے کہ

فاطمہؑ کی نظر میں شیعیاں حیدر گراں اور اصحاب علیؑ ہیں ایسے افراد ضرور رہے ہوں گے جو فاطمہؑ کو سچا سمجھتے تھے اور ان کے ذریعے سے فاطمہؑ نصاب شہادت کامل کر سکتی تھیں، لیکن فاطمہؑ کا یہ نہ کرنا تبتا ہے کہ ان کا مقصد صرف اثبات میراث عطیہ نہ تھا بلکہ نتائج سقیفہ کے خلاف اقدام تھا اور وہ فدک میں اقامت شاہدین سے نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اس امر پر شاہد جمع کرنے سے ہو گا کہ یہ لوگ حقیقی صراط مستقیم سے گمراہ ہو گئے ہیں اور یہی وہ باتیں تھیں جنہیں فاطمہ زہراؑ نے اپنے اقوال و اعمال سے نمایاں کر دیا۔

آئیے اب اس کے بعد خلیفہ کے کلمات سنیں۔ جب فاطمہ زہراؑ مسجد سے واپس چلی گئیں تو خلیفہ نے منبر پر جا کر یوں خطاب کیا:

”اے لوگو! تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ ہر بات مسن لیتے ہو، انہیں تو یہ امیدیں عہد رسولؐ ہی سے تھیں جس نے سنا ہے وہ کہے، جو جانتا ہو وہ بولے۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ (علیؑ) ایک لومڑی کے مانند ہے جس کی گواہ اس کی دم ہو، وہ فتنوں کی آماجگاہ ہے۔ اس کی شان اُمّ طہال کی ہے جسے صرف اپنے چاہنے والوں سے محبت ہوتی ہے۔ یاد رکھو میں اگر چاہوں تو کہہ سکتا ہوں اور اگر کہوں گا تو کھل کر کہوں گا لیکن اس وقت مناسب نہیں ہے۔“

پھر انصار سے متوجہ ہو کر کہا:

”اے گردہ انصار! مجھے تمہارے بیوقوفوں کے کلمات کی اطلاع ملی ہے، تم عہد رسولؐ کی پابندی کے زیادہ حقدار تھے، لیکن جب وہ تمہارے پاس آئے تو تم نے انہیں پناہ دی اور ان کی نصرت کی یاد رکھو میں کسی غیر مستحق کو سزا دینا نہیں چاہتا۔“

اس کلام سے خلیفہ کی شخصیت کافی الجھل اندازہ ہوتا ہے اور فاطمی نزاع

سے زبان قلم لڑتی ہے کہ اس کلام کی شرح کس طرح کریں کہ جسے خلیفہ وقت نے نہایت ہی آزادی کے ساتھ اپنی زبان پر جاری کیا۔ یاد رکھیے کہ ام طہال عرب کی ایک مشہور بدکار عورت کا نام ہے۔ تو پھر کیا اس جبارت کے بعد بھی شیعیاں علیؑ پر یہ الزام باقی رہ جاتا ہے کہ وہ صحابہ کو برا بھلا کہتے ہیں؟ کیا حضرت علیؑ صحابہ میں نہیں ہیں؟ مترجم

پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔ اس وقت جو بات زیادہ اہم ہے وہ یہ کہ خلیفہ نے بھی فاطمی مطالبہ سے یہ اندازہ کر لیا تھا کہ صرف میراث و عطیہ کا مطالبہ نہیں ہے۔ اسی لیے انھوں نے روئے سخن علیؑ کی طرف موڑ دیا اور انھیں کی مذمت شروع کر دی۔ میراث کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ یہ باتیں اس امر پر روشنی ڈالتی ہیں کہ فاطمہ کا اقدام اس حق کے مطالبہ کے لیے تھا جو ان کے شوہر کو آسمان سے حاصل ہوا تھا اور جس کے وہ دائمی اہل تھے۔

اس کے علاوہ وہ روایت بھی قابل دید ہے کہ جو صحاح اہلسنت میں موجود ہے کہ علیؑ و عباسؑ میں عمر کے زمانہ میں فدک کے بارے میں جھگڑا ہوا۔ علیؑ کا دعویٰ تھا کہ رسولؐ نے فاطمہؑ کو ہدیہ کر دیا تھا اور عباسؑ اس کے منکر تھے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ ملک رسولؐ ہے اور میں اس کا وارث ہوں۔ عمر کے پاس معاملہ پیش ہوا اور انھوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ اپنے حالات تم بہتر سمجھتے ہو۔ میں نے تم دونوں کے حوالے کر دیا۔

اگر یہ روایت صحیح ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ خلیفہ اول کا حکم صرف وقتی سیاست کی بنا پر تھا۔ ورنہ عمر بن الخطاب ان کی بیان کردہ حدیث پر ضرور عمل کرتے۔ اور حالات یہ بتاتے ہیں کہ عمر نے دونوں کو فدک بطور میراث دیا تھا نہ بطور وکالت۔ ورنہ اگر ایسا ہوتا تو عمر کو بھی یہ فیصلہ کرنا چاہیے تھا کہ تم دونوں وکیل ہو۔ یہ نزاع بالکل بیکار ہے۔ مزید برآں یہ کہ تنہا علیؑ کو نہ دینا یہ بتاتا ہے کہ عمر کو دعویٰ عطیہ کا بھی اعتبار نہ تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ فدک دونوں کو بطور میراث دیا گیا تھا اور بس۔

اب اس مسئلہ کی دو صورتیں ہو گئیں :

۱۔ وکالت کا تصور اس مقام پر اس طرح پیدا ہو سکتا تھا کہ حضرت عمر فدک کو مسلمانوں کا مال ہونے کی بنا پر حکومت کی ذمہ داری رکھتے اور ان دونوں حضرات کو حکومت کی طرف سے اس کے انتظامات کا ذمہ بنا دیتے۔ مترجم

- ① — عمر، خلیفہ اول کو واضح حدیث سمجھتے تھے۔
 ② — عمر حدیث کے ایسے معنی سمجھے جو کہ سنائی وراثت نہ تھے لیکن انھوں نے اسے بیان نہیں کیا۔

اب چاہے یہ احتمال صحیح ہو یا وہ۔ لیکن سیاسی پہلو بالکل آشکار ہے ورنہ اگر مسیلا سیاست و وقت کے اعتبار سے حل نہ کیا جاتا تو عمر، ابو بکر کو واضح حدیث کہتے یا اوہل کو مخفی نہ کرتے جبکہ انھوں نے اکثر مسائل میں رسول اسلام اور ابو بکر کے رد و پروان کی تردید کی ہے۔

جب ہمیں یہ معلوم ہو گیا کہ فاطمہؑ کا مطالبہ اس وقت شروع ہوا جب لوگ حکومت اسلامی کو غضب کر چکے تھے حالانکہ کسی شخص نے اپنی میراث خلیفہ سے طلب نہیں کی تو واضح ہو گیا کہ مطالبہ میراث ایک پہا نہ تھا اس اقدام کی ابتدا کا جو فاطمہؑ زہراؑ صابین خلافت نبی اکرمؐ کے خلاف کرنا چاہتی تھیں اور جس سے اپنے شوہر کے حقوق کا تحفظ کرنا چاہتی تھیں۔

جب کہ یہ واضح ہو گیا کہ فاطمہؑ نے اپنے حق کا مطالبہ غضب خلافت سے پہلے نہیں کیا تو معلوم ہو گیا کہ حالات زمانہ فاطمہؑ کی پوری پوری حمایت کر رہے تھے کہ قصہ میراث کو بہانہ قرار دے کر اٹھ کھڑی ہوں،

اور امت کے سامنے ثابت کر دیں کہ وہ لوگ ہرگز مستحق خلافت نہیں ہو سکتے جو نبی رسولؐ کا حق غضب کر لیں اور قوانین شریعت کا استخفاف کریں۔ فاطمہؑ ایسا نہ کرتیں تو آج حق و باطل کا امتیاز مٹ کر رہ جاتا۔

حکومت میں جماعتی رنگ آمیزی

اگر ہم چاہیں کہ اس نزاع کا مطالبہ ان حالات کی روشنی میں کریں جن میں

یہ نزاع قائم ہوئی تو ضرور اس امر کی ہوگی کہ مختصر طریقے سے اس عہد انقلابی کی تفسیر کوشی
مبھی کر دیں تاکہ اپنے موضوع سے خارج نہ ہونے پائیں۔

ہماری مراد اس انقلاب سے اس کے معنی حقیقی ہیں۔ اس لیے
اس عہد میں قانون اسلام منقلب ہو گیا تھا۔ اور سچائے ملکیت ایسی جمہوریت قائم ہو
گئی تھی جس کے تمام اختیارات اور صلاحیات عوام الناس کے ہاتھوں میں تھے۔ جب کہ پیغمبر
کی ساری استعداد ممنون احسانِ ساوی تھی۔

جس وقت کہ بشیر بن سعد نے خلیفہ کے ہاتھ پر ہاتھ مارا، اس وقت سے
تاریخ اسلامی میں ایک نئے باب کا آغاز ہو گیا۔ اور اس دور جدید کے درمیان جس کا
آغاز اب ہو رہا ہے، یہ حادثہ اس دن پیش آیا جب حیاتِ نبوت کی آخری ساعت ختم
ہو رہی تھی۔ اور زمین و آسمان کے مقدس اور بابرکت رشتے منقطع ہو رہے تھے۔

جس وقت پیغمبر کی آخری ساعتیں ختم ہوئیں اور ان کی روح
اقدس مارا اعلیٰ کی طرف پرواز کر کے قبابِ تو سین او ادنیٰ کی منزلوں میں پہنچ گئی، لوگ
اس بیت النبوة کی طرف متوجہ ہوئے کہ جس سے محمدی شعا میں نکل رہی تھیں تاکہ عہد رسالت
کو رخصت کریں اور اس نبوت کی تشریح کریں جو کلیدِ شراعت است اسلامیہ اور بر غلظت
دینِ اسلام تھی۔

لوگ بیت رسالت کی طرف اس عالم میں چلے کہ ان کے دلوں میں مختلف
خیالات، متفرق احساسات تھے۔ ان کے افکار پر پیغمبر کے تذکرے چھائے ہوئے
تھے، جلالت رسالت کا پہرہ تھا۔ وہ یہ خیال کر رہے تھے کہ یہ دس سال جو نبوت

نے یہ یاد رہے کہ اسلامی ملکیت سے مراد آج کی مشاہی نہیں ہے بلکہ اس سے مراد وہ
سلطنت ہے کہ جس کا بادشاہ الٰہ الملوک ہے اور جس کے نظام زندگی میں بنیر حکم خدا

کسی انسان کی اطاعت جائز نہیں ہے۔ مترجم

کے سایہ رحمت میں گزارے ہیں شاید ایک خواب تھا جو چند لمحوں تک قائم رہا اور اس سے انسان اس عالم میں بیدار ہوا کہ چاروں طرف سے مصائب میں گھرا ہوا ہے۔ مسلمان اس بے پناہ شدت اور ہولناک خاموشی کے عالم میں تھے کہ کسی کی زبان سے کوئی کلمہ نہ نکلتا تھا بلکہ ہر شخص اپنے آنسوؤں اور حسرتوں سے بیت رسالت کو پُرسا دے رہا تھا کہ ایک دفعہ ایک آواز سنائی دی جس نے نضاؤں میں پھیل ڈال دی۔ اور خاموشی کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ وہ آواز یہ تھی کہ:

» محمدؐ کا استقبال نہیں ہوا، اور جب تک دین اسلام عالم پر غالب نہ آجائے وہ نہیں مر سکتے۔ عنقریب پلٹ کر آئیں گے اور جس نے ان کی موت کا اعلان کیا ہے اس کے ہاتھ پیر کاٹ ڈالیں گے۔ میں جسے یہ کہتا سنوں گا کہ محمدؐ مر گئے اس کی گردن اڑا دوں گا!«

ساری نظریں اس مرکز کی طرف متوجہ ہو گئیں کہ دیکھیں کہ آہنہ کیس کی صدا ہے!

دفتار دیکھا کہ عمر بن الخطاب خطبہ دے رہے ہیں اور ان کی رائے میں اتنی شدت ہے کہ جو کسی تذبذب کے قابل نہیں۔ اب لوگوں میں خبر حیات البنی دوبارہ نشر ہو گئی اور اس موضوع پر چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔

میرا خیال ہے کہ یہ رائے اکثر لوگوں کی نظر میں عجیب و غریب معلوم ہوئی ہوگی بلکہ بعض لوگوں نے تکذیب کا قصد بھی کیا ہوگا۔ لیکن کہنے والے کا اپنے قول پر اٹل رہنا اس بات سے مانع ہو گیا ہوگا اور لوگوں نے جمع ہو کر اس قول پر تبصرہ ضرور شروع کر دیا ہوگا۔ یہاں تک کہ ابو بکر آگے جو کہ اس وقت اپنے مکان میں تھے انہوں

نے آتے ہی کہہ دیا :

”ایہا انکاس! جو محمد کی عبادت کرتا تھا وہ کچھ لے
کہ محمد مر گئے اور جو اللہ کا بندہ تھا اس کا خدا زندہ ہے قرآن
کہتا ہے کہ پیغمبر تمہیں بھی ایک دن مرنے والے ہے۔ اگر پیغمبر دنیا سے
اٹھ گیا تو کیا تم لوگ کافر ہو جاؤ گے؟“

ادھر عمر نے یہ آواز سنی اور انھیں وفات پیغمبر کا یقین ہو گیا۔

وہ کہتے لگے۔ میں نے پہلے یہ آیت سنی ہی نہ تھی۔

میری نظر میں وہ لوگ جو اس واقعہ کو ابو بکر کی شجاعت اور ان کی شوکتِ
خلافت کی دلیل سمجھتے ہیں قطعاً خطا پر ہیں۔ اس لیے کہ عمر کو نوک دینا کوئی بڑی بات نہ
تھی، جب کہ تاریخ شاہد ہے کہ اس وہم میں عمر کا کوئی شریک نہ تھا۔ بلکہ یہ ان کی ذاتی
راسخونگی تھی۔

اس بحث کا لازمہ یہ ہے کہ میں اس بات کی تحقیق کروں کہ خلیفہ وقت
کا وہ خطاب جو لوگوں کے سامنے پیش کیا گیا وہ ایک بے ربط کلام تھا جس کو مسلمانوں
کے تڑپتے ہوئے احساسات سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ بلکہ انھوں نے تو بیانِ حادثہ میں اس سے
زیادہ کچھ نہیں کہا کہ محمد کے عابد سمجھ لیں کہ محمد مر گئے۔ حالانکہ ایسے موقع پر ابو بکر سے یہ امید تھی
کہ وہ مرنے والے کا پُرسا دیں گے اور ان جذبات و حسرات کا خیال کریں گے جو مسلمانوں کے
دلوں میں بھڑک رہے ہیں۔

مجھلا وہ کون سا انسان تھا کہ جو سید الانبیاء کی عبادت کرتا تھا کہ جس سے
کہا جائے کہ تمہارا معبود مر گیا۔ کیا کلامِ عمر کے کسی لفظ سے یہ خیال کیا گیا کہ وہ عابد محمد تھے؟
یا ارتداد والحاد کی بہریں اس اجتماعِ مومنین میں دوڑ رہی تھیں کہ جو چند ساعت
قبل تک رسول کے سایہ رحمت میں پرورش پاتا تھا اور جس کے آنسو وفاتِ پیغمبر

پر مسلسل بہہ رہے تھے۔

اب واضح ہو گیا کہ ابو بکر کے خطاب کو نزاکت و وقت اور اعلانِ عمر سے کوئی لگاؤ نہ تھا اور نہ اسے اسلامی جذبات ہی سے کوئی تعلق تھا۔

اسی اجتماع کے مقابلہ میں ایک دوسرا اجتماع انصار کا سقیفہ نبی ساعدہ میں ہوا جس کی ریاست رئیس خزیج سعد بن عبادہ کے ہاتھ میں تھی۔ وہاں لوگوں کو حکومتِ اسلامی قائم کرنے کے لیے بلایا گیا اور یہ بحث شروع ہو گئی کہ اگر ہاجرین نے انکار کر دیا تو کیا ہو گا اور اپنی قرابت کا واسطہ دیا تو ہم کیا کریں گے۔

ایک شخص بول اٹھا، ایک امیر ہم میں سے ہو گا ایک ان میں سے۔

سعد نے کہا۔ یہ پہلی کمزوری ہے۔

جب عمر کو یہ خبر ملی تو خانہ رسول اکرم تک آئے جہاں ابو بکر تھے، آدمی بھیج کر انہیں بلوایا۔ انہوں نے غدر کیا۔ دوبارہ طلب کیا اور واقعہ کی اہمیت کا واسطہ دیا۔ وہ نکلے تو انہیں اطلاع دی۔ اور دونوں دوڑتے ہوئے سقیفہ کی طرف چلے یا ان کے ساتھ ابو عبیدہ بھی تھے۔

ابو بکر نے پہنچتے ہی ہاجرین کی قرابت کا ذکر شروع کر دیا اور بولے

ہم امیر اور تم وزیر ہو۔ تم سے رائے مشورہ کرتے رہیں گے۔

حباب بن منذر نے کھڑے ہو کر کہا

”اے انصار! اپنے امیر کی حفاظت کرو۔ لوگ تمہارے

زیر سایہ عطفوت ہیں، کسی میں تمہاری مخالفت کی جرأت نہیں ہے،

تم اہل عزت و شرافت و عدو و کثرت ہو، تم صاحبِ رعب و

کرامت ہو۔ اگر یہ زمانیں تو تم میں سے بھی امیر ہو اور ان میں سے بھی

عمر بول اٹھے: ایک پیام میں دو تلواریں نہیں ہو سکتیں عرب

اس امر سے خوش نہیں کہ تم کو امیر مانیں جبکہ رسولؐ تم میں سے نہیں۔ لیکن عرب میں امیر مان لیں گے چونکہ تم اقربا و اولیا رسول اکرمؐ ہیں۔
حباب نے دوبارہ تاکید کی۔

اپنے ہاتھوں کو قابو میں رکھو، ایسی باتیں مت سنو، ورنہ تمھارا حق ضائع ہو جائے گا۔ تمھاری تلواروں سے دین کی بنیادیں مستحکم ہوئیں۔ میں ان باتوں کو خوب سمجھتا ہوں۔ تم اگر میرا ساتھ دو تو تمام کام درست ہو جائے گا۔
عمر نے کہا:

”اللہ تجھے ہلاک کر دے گا۔“
وہ بولا: ”تجھے قتل کر دے گا۔“
ابوعبیدہ نے کہا:

”گروہ انصار! تم نے شروع سے پیغمبرؐ کی مدد کی، اب چاہتے ہو کہ دین نبیؐ میں تغیر پیدا کر دو۔“
بشیر بن سعد کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا:

”اے انصار! محمدؐ قریش سے ہیں اور وہ زیادہ مستحق ہیں میں اس امر پر نزاع نہیں کر سکتا۔“

ابوبکر نے کہا: ”یہ عمر اور ابوعبیدہ ہیں، کسی ایک کی بیعت کر لو۔“
وہ دونوں بولے: ہم اس کے اہل نہیں، آپ افضل المہاجرین اور نماز میں خلیفہ رسولؐ ہیں آپ ہاتھ پھیلائیے۔

انھوں نے ہاتھ بڑھا دیا۔ بشیر بن سعد نے پڑھ کر بیعت کر لی۔
حباب نے آواز دی: ”اے بشیر! تو اپنے ابن عم سے حسد کرتا ہے؟“
اسید بن خضیر بولا: اچھا ہوا، ورنہ اگر سعد کی بیعت ہو جاتی تو خزرج کو

اوس پر دائمی تفضیلت مل جاتی۔

سب نے ابو بکر کی بیعت کرنی اور چاروں طرف سے لوگ برائے بیعت آنے لگے۔ اس قصہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ عمر نے سقیفہ کی خبر سنی اور پھر ابو بکر کو اطلاع دی۔ اس کا تعلق کسی وحی سماوی سے نہیں تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے ابو بکر کے آنے کے بعد بیعت رسول کو چھوڑ دیا۔

سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں کیا؟

اور یہ خیر صرف ابو بکر کو کیوں دی؟

ان امور کی کوئی معقول وجہ علاوہ اس کے نظر نہیں آتی کہ تینوں میں

پہلے سے کچھ ساز باز تھی۔ اس امر کے تاریخ میں حسیہ ذیل شواہد ملتے ہیں :

① — عمر نے سقیفہ کی اطلاع صرف ابو بکر کو دی اور باوجود عذر کرنے کے انھیں آنے پر مجبور کیا۔ یہاں تک کہ جب عرض بیان کر دی تو دونوں دوڑ کر وہاں پہنچ گئے۔ اگرچہ یہ ممکن تھا کہ جب انھوں نے عذر کیا تھا تو دوسرے ہاجرین کو بلا لیا جاتا مگر ظاہر ہے کہ اس حرص و طمع کی علت دوستی کو نہیں قرار دیا جاسکتا اس لیے کہ مسئلہ دوستی کا نہ تھا اور پھر ہاجرین کے استحقاق کا دار و مدار عمر کے دوستوں پر نہ تھا بلکہ ہر وہ شخص اس کام کے لیے کافی تھا جو اس امر میں ان کا ساتھ دے سکے۔ یہ بھی ناقابل فراموش بات ہے کہ عمر خود ابو بکر کو بلانے نہیں گئے بلکہ آدمی بھیج کر بلا لیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ خبر منتشر ہو جائے اور بنی اشم اس امر پر مطلع ہو جائیں۔ اپنے قاصد سے یہ بھی کہہ دیا

کہ ایک کام درپیش ہے جس میں تمہاری عارضی سخت ضروری ہے
 میں نہیں سمجھتا کہ اس میں ابو بکر ہی کی کیا ضرورت تھی، اگر پہلے
 سے کوئی سازش نہ ہوئی کہ جسے کامیاب بنانے کی کوشش ہو رہی تھی۔
 وفاتِ نبی کے بارے میں عمر کا موقف اور ان کا انکار اس سلسلے
 میں ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ عمر کے حواس معطل ہو گئے تھے۔ اس لیے
 کہ ان کی زندگی اس قسم کی نہیں ہے جس کا صحیح اندازہ اس اتہام
 سے ہوتا ہے جو انھوں نے سفینہ میں پہنچنے کے بعد کیا ہے۔ ظاہر
 ہے کہ جو شخص کسی واقعہ کو سن کر بدحواس ہو جائے اس میں اتنی فکر
 نہیں ہو سکتی کہ انصار کے مقابلہ میں باقاعدہ جہاد و دفاع جہاد
 مناصبت سے کام لے۔ یہیں یہ معلوم ہے کہ یہ رائے جس کا اعلان
 عمر نے بعد وفاتِ نبی اکرم کیا۔ اس کا عقیدہ انہیں چند روز
 قبل تک نہ تھا جب پیغمبرؐ نے فرمایا۔ مجھے روات و قائم و تاکہ
 ایسا نوشتہ لکھ دوں جو میرے بعد کام آئے۔ اور عمر نے کہہ دیا کہ
 کتاب اللہ کافی ہے اور پیغمبرؐ پر مہن کا غلبہ ہے۔ وہ یہ بیان
 تک رہے ہیں (نورِ باہد) اس وقت تک ان کا اعتقاد تھا
 کہ پیغمبرؐ کو موت آئے گی۔ ورنہ فوراً لوگ دیتے اور کہہ دیتے
 کہ نبیؐ کے لیے موت نہیں ہے۔ تاریخِ ابن کثیر میں یہ بھی ہے
 کہ ابو بکر سے پہلے عمر بن زائدہ نے یہی آیت پڑھ کر عمر کو سنائی
 تھی لیکن انھوں نے کوئی توجہ نہ کی۔ جب وہی آیت ابو بکر نے
 پڑھی تو اعتبار آگیا۔ سہلانا بیجے اس کا اور کیا مطلب ہو سکتا ہے
 اگر یہ نہ کہا جائے کہ عمر نے اپنی گفتگو سے مسلمانوں میں ایک

اضطراب پیدا کرنا چاہتا تھا، تاکہ لوگ اس کلام کی طرف متوجہ نہ ہو جائیں اور ابو بکر کے آنے سے پہلے خلافت کے بارے میں کوئی فیصلہ نہ ہو جائے۔ یہاں تک کہ ابو بکر کے آنے ہی ان کا دل مطمئن ہو گیا اور سمجھ گئے کہ اب بیتِ ہاشمی کی بیعت اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک مقابلہ کے امکانات باقی ہیں۔

حکومت کی وہ ترتیب جو سقیفہ میں تشکیل پائی، ابو بکر والی خلافت ابو عبیدہ والی مال اور عمر والی قضاوت اور آج کی اصطلاح میں پہلا والی سلطنت، دوسرا وزیر اقتصادیات، تیسرا وزیر جنائیات اور یہی حکومت اسلامیہ کے عظیم ارکان ہیں۔ ظاہر ہے کہ حکومت کی یہ ترتیب اور عہدوں کی یہ تقسیم جو کہ سقیفہ میں عمل میں آئی، کسی وقتی چارہ جوئی کا نتیجہ نہیں ہو سکتی۔

عمر کا وقت وفات یہ کہنا کہ اگر ابو عبیدہ ہوتے تو انہیں کو حاکم بنا دیتا۔ ظاہر ہے کہ اس تمنا کا سبب ابو عبیدہ کی صلاحیت نہ تھی اس لیے کہ عمر کو علیؓ کی استعداد کا پورا علم تھا لیکن اس کے باوجود انہوں نے زچا کہ علیؓ ان کی زندگی میں یا بعد موت حاکم ہو سکیں ابو عبیدہ کی امانتداری (جیسا کہ عمر کا خیال ہے) بھی اس بات کی موجب نہ تھی اس لیے کہ پیغمبرؐ نے صرف ابو عبیدہ کی توصیف نہیں کی بلکہ اس دور میں ایسے اصحاب موجود تھے جنہیں پیغمبرؐ نے اس سے زیادہ محترم قرار دیا تھا جیسا کہ صحاح سنت و شیعہ میں

۱۔ تاریخ ابن اثیر، ج ۱ ص ۱۶۱

۲۔ شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید، ج ۱ ص ۶۳

۳۔ الانساب بلاذری، ج ۵ ص ۱۱۱

موجود ہے۔

۵۔ فاطمہ زہرا کا حزبِ حاکم کو پارٹی بندی پر مستہم کرنا (جیسا کہ آئندہ آئے گا)

۶۔ امیر المومنین کا وہ کلام جو آپ نے عمر سے فرمایا تھا، اے عمر وہ دودھ مہیا کرے جس میں تیرا بھی حصہ ہے آج کی محنت کل نتیجہ دے گی۔ اس کلام سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں اتفاق کی طرف اشارہ ہے جو دونوں میں پہلے سے ہو گیا تھا۔ درر علیؑ تو سقیفہ میں موجود بھی نہ تھے وہ کیا سمجھتے کہ خلافت کس ترتیب سے قرار دی گئی ہے۔ (العیاذ باللہ)

۷۔ معاویہ کا وہ خط جو اس نے محمد بن ابوبکر کو لکھا تھا اور اس میں تذکرہ کیا تھا کہ تیرے باپ اور عمر نے علیؑ کے حق کو غصب کیا تھا چنانچہ لکھتا ہے: ہم اور تمہارے دونوں علیؑ کے فضل کو سمجھتے تھے، ان کا حق ہم پر واجب الوجود تھا۔ لیکن جب رسول اکرمؐ نے دنیا سے رحلت فرمائی تو تمہارے باپ اور فاروق نے ان کی مخالفت کر کے ان کا حق چھین لیا۔ اور اپنی بیعت لینا شروع کر دی اور اس سے مقصد ایک بہت بڑی بات تھی۔

واضح ہے کہ بیعت کا دونوں کے اتحاد کے بعد ذکر کرنا اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ یہ ایک سازش تھی جو آج کے پہلے سے تیار ہو چکی تھی۔

میں اپنے موضوع کو اس سے زیادہ طویل دینا نہیں چاہتا، صرف یہ پوچھنا چاہتا

ہوں کہ کیا کوئی تاریخی ثبوت یہ بتانا ہے کہ ابو بکر خلافت نہ چاہتے تھے جیسا کہ بعض کا خیال ہے مجھے تو سقیفہ کے قصہ ہی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ خلافت کے بڑے خواہاں تھے۔ اس لیے کہ خلافت کے شرائط بیان کرنے کے بعد انھوں نے فوراً دونوں ساتھیوں کا نام پیش کر دیا۔ جس کا طبعی نتیجہ یہ تھا کہ کسی ایک کے لیے بات طے ہو جائے۔ خلیفہ کی یہ جلد بازی اور پھر اس ترتیب کے ساتھ اس امر کا پتہ دیتی ہے کہ ان کا مقصد اپنے ساتھیوں کو آگے بڑھا کر انصار کا حق چھیننا تھا، جس کا نتیجہ اپنا تقرر ہونا۔ اس لیے کہ جب دونوں نے ان کا نام پیش کر دیا تو انھوں نے کوئی تردد ظاہر نہ کیا۔ اور فوراً قبول کر لیا۔

اسی بات کو عمر نے بیان کیا ہے ایک طویل حدیث میں جس میں واضح کیا کہ وہ (ابو بکر) طالب حکومت اور حاسد ترین قریش تھے۔
 زمانہ حیات پتہ میں بھی شیخین کے حالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے دلوں میں کوئی ہم ضرور تھی جس کے لیے برابر کوشاں تھے جیسا کہ روایات اہل سنت میں وارد ہوا ہے کہ رسول اکرم نے فرمایا

”میں نے تشریح قرآن پر جہاد کیا ہے تم میں سے ایک شخص تاویل قرآن پر جہاد کرے گا۔“

ابو بکر بولے : میں ہوں ؛ عمر بولے : میں ہوں ؛

آپ نے فرمایا : ”وہ جو جوتی ٹانگے والا ہے۔ یعنی علی۔“

ظاہر ہے کہ تاویل پر جنگ زمانہ رسول کے بعد ہوگی اور مجاہد بھی امیرانہ ہوگا۔ اس لیے دونوں کو تنہا تھی کہ مجاہد ہم ہوں۔ حالانکہ تشریح پر جہاد ان کے لیے زمانہ رسول میں زیادہ آسان تھا لیکن انھوں نے اس میں مطلقاً شرکت نہ کی۔ ان امور سے خلفاء وقت کی نفسیات کا صحیح اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

بلکہ اس سے آگے بڑھ کر یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ کچھ لوگ حیاتِ رسول اکرم ﷺ میں ایسے تھے جو ابوبکر اور عمر کے لیے کام کر رہے تھے، جن کی راس و رئیس عائشہ و حفصہ تھیں جنہوں نے اپنے والدین کو فوراً بلا بھیجا جب پیغمبر نے وقتِ آخر اپنے حبیب کو طلب کیا اور حالات نے بتایا کہ پیغمبر کوئی وصیت کرنا چاہتے ہیں۔

بلکہ یہ ظاہر ہے کہ وہ روایت جس میں یہ وارد ہوا ہے کہ بعض ازواجِ نبویہ نے اسامہ کے لشکر کو روک دیا تھا، اس سے مراد بھی یہی عورتیں ہیں۔ کھلی ہوئی بات ہے کہ نبی اکرم ﷺ اس وقت سے ہرگز راضی نہ تھے ورنہ بعد میں آپ نے جلدی کرنے کا حکم نہ دیا ہوتا۔ اور یہ اس بات کی صاف دلیل ہے کہ ان لوگوں کا رک جانا اور ان عورتوں کا روک دینا، کسی خاص سازش کی بنیاد پر تھا کہ جس میں ان کے چلے جانے سے کامیابی حاصل نہ ہو سکتی۔ یہ بات بھی ہمارے دعویٰ کو بخوبی واضح کرتی ہے۔

پیغمبر اسلام کے لشکرِ اسامہ کو صحیحی کی جو تفسیر شیعوں نے کی ہے، اس سے دنیا واقف ہے اور وہ یہ کہ رسول کریم نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ کچھ لوگوں نے اس خاص بات پر اتفاق کر لیا ہے کہ اب اگر یہ لوگ مدینہ میں رہ گئے تو علیؑ سے مزور مقابلہ کریں گے۔ اگر ہم اس بات میں شک کریں تو کم از کم اتنا تو یقینی ہے کہ پیغمبر نے کئی مرتبہ علیؑ و ابوبکر کو ترازو کے پلوں میں رکھ کر دنیا کو دکھا دیا تھا کہ ان دونوں میں کبھی برابری نہیں

ہے۔ سنہ ۲ھ میں ہے کہ پیغمبر نے قریش کو ایک ایسے مردِ جری سے ڈرایا کہ جس کے دل کا استخوان اسٹہ ایمان کے لیے کرچکا تھا اور وہ دین کی خاطر قریش کی گردنیں اڑائے گا۔ تو ایک سائل نے پوچھا وہ مرد ابوبکر ہے آپ نے فرمایا نہیں۔ پوچھا عمر، آپ نے فرمایا نہیں۔ روایت میں اس سائل کا نام نہیں ہے لیکن واضح ہے کہ جبکہ ابوبکر و عمر کی شجاعت و بہادری کا کوئی چرچا نہ تھا تو سائل کی غرض کچھ اور ہی ہوگی۔ اس کا فیصلہ آپ کے ذمہ ہے۔

ہو سکتی۔ اگر ایسا نہیں ہے تو کیا یہ فطری بات ہے کہ سورہ برأت ایک شخص کو دیا جائے اور پھر چھپن لیا جائے۔ وحی الہی اس امر کی منتظر تھی ابو بکر آدھے راستے تک پہنچ جائیں تو نازل ہو کر انہیں واپسی کا حکم دے اور علیؑ کو بھیج دے۔

کیا اس کو عیبٹ کہا جائے یا غفلت یا کوئی تیسری بات؟ اور وہ یہ کہ رسولؐ نے محسوس کر لیا کہ ابو بکر میرے ابن عم سے حسد کرتے ہیں۔ لہذا چاہا کہ ابو بکر کو بھیج کر واپس بلا لیا جائے۔ اور دنیا پر یہ واضح ہو جائے کہ کار تبلیغ علیؑ ہی کا کام ہے جو کہ نفس رسولؐ ہے نہ کہ ابو بکر کا۔ اب اگر ایک شخص ایک سورہ کا امین نہ بن سکے تو پورے قرآن کا امین کیسے بن سکتا ہے۔

ہم ان تمام بیانات کو دو مختصر نتیجوں پر ختم کرتے ہیں:

① — خلیفہ کو خلافت کی بڑی فکر تھی۔ چنانچہ وہ اس کے لیے برابر کوشاں رہتے تھے۔

② — صدیق و فاروق و ابو عبیدہ ایک سیاسی پارٹی بنائے ہوئے تھے جس کے نمایاں خطوط تاریخ میں نظر نہیں آئے لیکن اس کے وجود پر متعدد تاریخی شواہد موجود ہیں۔ اس میں ان کی کوئی توہین نہیں ہے بلکہ انہیں یہی فکر ہر وقت رہنی چاہیے تھی، اگر رسول اللہؐ کی کوئی نص اس موضوع میں نہ ہوتی لیکن اگر نص رسولؐ ثابت ہو جائے تو پھر سیاست سے ان کی ظاہری علیحدگی اور سقیفہ کی کارروائی کو وقتی چارہ جوئی قرار دینا انہیں خدائی مسؤلیت سے بری نہیں کر سکتا۔

حزبِ حاکم کی رفتار اہل محمد کے ساتھ

ہیں اس وقت اس موقف کا تجربہ نہیں کرنا چاہتا جس میں انصار اور

تین جہاجیرین میں مقابلہ ہوا تھا تاکہ یہ معلوم کیا جائے کہ اس وقت مسلمانوں کی نفسیات کیا تھیں اور سیاسی مزاج کیسا تھا، اس لیے کہ یہ باتیں میرے موضوع سے ایک حد تک دور ہیں۔ مجھے صرف یہ دیکھنا ہے کہ اس وقت اس سلفی جماعت کے تین گروہ مخالف تھے۔

① — انصار: جنہوں نے خلیفہ اور ان کے ساتھیوں کے ساتھ سقیفہ

میں جھگڑا کیا اور اس دینی منصب کے لیے بھی رشتہ داری اور قربت کی اہمیت کے قائل ہوتے اور دو گروہوں میں تقسیم ہونے کی بنا پر ناکام ہو گئے۔

② — بنی امیہ: جن کا مقصد یہ تھا کہ حکومت انہیں بھی ملے اور وہ

سیاسی بزرگی کہ جو انہیں ایام جاہلیت میں حاصل تھی پھر پلٹ آئے۔ اس جماعت کا لیڈر ابوسفیان تھا۔

③ — بنی ہاشم اور ان کے رفقاء: عمار، سلمان، ابوذر و مقداد

وغیرہم جن کا خیال تھا کہ نبیؐ کا طبیعتی وارث ہاشمی گھرانہ ہے۔

ابوبکر اور ان کے ساتھیوں نے پہلی جماعت سے مقابلہ کیا اور اپنی اہمیت کے

لیے ایسی بات پیش کر دی جو وقتی طور سے بہت کامیاب رہی۔ اس لیے کہ جب قریش عشرہ رسولؐ میں رہیں گے تو ان کے مقابلے میں کوئی دوسرا فریق نہیں آسکتا۔

ابوبکر اور ان کے اصحاب کو انصار کے سقیفہ میں اجتماع کرنے

سے دو فائدے حاصل ہوئے:

① — وہ انصار جنہوں نے اپنا مستقل مذہب بنا لیا تھا اب اس

امر سے مجبور ہو گئے کہ وہ علیؑ کا ساتھ دیں اور حقیقت کو اجاگر کر سکیں۔

② — ابوبکر کو جہاجیرین کے حقوق سے دفاع کرنے کا ایسا موقع ہاتھ آ

گیا تھا جیسا موقع شاید ان کو زندگی بھر ہاتھ نہ آتا۔ اس لیے

کہ جہاں چند مہاجرین جمع ہو جاتے وہاں ان کے حضور میں کوئی منصب ان کے ہاتھ نہ لگتا۔

ابوبکرؓ سفید سے اس عالم میں برآمد ہوئے کہ مسلمانوں کی ایک جماعت ان کے ساتھ تھی یا اس لیے کہ انھوں نے اس دلیل کو پسند کر لیا تھا جو ابوبکر نے پیش کی تھی۔ یا اس لیے کہ وہ سعد بن عبادہ کے ہاتھ پر بیعت نہیں کرنا چاہتے تھے۔

حکام دنت نے بنی امیہ کے مقابلہ کی کوئی پرواہ نہیں کی۔ حالانکہ ابوسفیان نے اپنے سفر سے پلٹ کر بڑا ہنگامہ مچایا۔ صرت اس لیے کہ وہ لوگ بنی امیہ کی لاپٹی طبیعتوں سے واقف تھے۔ ان کی نظر میں ان لوگوں کا ساتھی بنالینا بڑا آسان کام تھا۔ جیسا کہ ابوبکر نے کیا اور خود یا عمر کے مشورے سے جلد اموالِ مسلمین جزا ابوسفیان کے ہاتھ میں تھے اس کے لیے مسابح کر دیے۔ اور مچھر بنی امیہ کو حکومت میں بھی ایک حصہ دے دیا۔

اس طرح سے حزبِ ماکم دونوں جماعتوں کے مقابلہ میں کامیاب تو ہو گیا لیکن اسے اس بات کی خبر نہ ہوئی کہ ہم نے ایک متضاد سیاست سے کام لیا ہے۔ اس لیے کہ سفید کا میدان حکام کو محسوس ہو کر رہا تھا کہ قرابتِ رسولؐ کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دیں اور ریاستِ دین کے لیے وراثت کو اصل قرار دیں۔

لیکن بعد کے حالات اس سے مختلف ہو گئے چنانچہ انھوں نے اپنی سیاست کا رخ بدل دیا۔ اس لیے کہ قرابتِ رسولؐ کی وجہ سے اگر قریشِ دوسروں سے افضل ہیں تو بنی ہاشم تو بہر حال سب سے افضل ہوں گے۔

اسی بات کا اعلان کرتے ہوئے امیر المومنین نے فرمایا تھا کہ :

یہ شرح بیچ البلاغ ج ۱ صفحہ ۱۳۱

تھے اس وقت کے مطالعہ سے اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے جو میں نے ابتدا میں اٹھایا تھا اور وہ یہ کہ اگر خلفاء کا موقف علیؑ کی طرح دشوار گزار ہوتا تو کیا کرتے۔

”اگر ان لوگوں نے انصار کے مقابلہ میں اپنی قربت کو پیش کیا تو ہماری حجت ان پر قائم ہے، لہذا اگر ان کی دلیل کامیاب ہے تو حق ہمارا ہے اور اگر ناکام ہے تو انصار صحیح کہتے ہیں۔“

اور اسی فقرہ کی وضاحت عباس نے ابو بکر کے سامنے سلسلہ بیان میں کر دی اور کہا کہ تمہارا خیال ہے کہ تم شجرہ پیغمبر سے ہو تو یاد رکھو کہ تم سہما یہ ہو اور ہم شاخیں۔

ایسے وقت میں ہاشمیین کی سہیت حکام وقت کے دلوں پر چھائی ہوئی تھی اس لیے کہ ان کی نظر میں علیؑ کے پاس دو طاقتیں تھیں:

① —————
 مادی جماعتوں کو اپنا ساتھی بنا لیں اور اس کی آسان ترکیب یہ تھی کہ ابوسفیان و منیرہ بن شعبہ وغیرہ جو اس وقت ضمیر فروری پر بڑی طرح آمادہ تھے ان کو کچھ دے کر ہموار کر لیں۔ جیسا کہ خود ابوسفیان نے خفیہ طور سے علیؑ سے کہا تھا اور یہی وجہ تھی کہ جب ابو بکر نے جملہ جمع کردہ مال اس کو بخش دیا تو خاموش ہو گیا۔ اور پھر زبان سے کوئی کلمہ نہ نکالا۔ اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک جماعت پر مادی خواہش غالب آگئی تھی اور علیؑ میں اتنی طاقت تھی کہ ان کا پیٹ بھر کر ان کو اپنا ساتھی بنا لیں اس لیے کہ ان کے پاس مالِ خمس اور غلاتِ فدک سے بہت کچھ جمع ہو سکتا تھا۔

② —————
 اس فکر سے کام لیں جو اس وقت عوام کے اذہان پر چھائی ہوئی تھی۔ اس لیے کہ لوگ خاندانِ رسالت کا زیادہ احترام کرتے تھے بہ نسبت ان لوگوں کے جو صرف شجرہ میں کبھی شریک رہے ہوں۔

اس کا اظہار علیؑ نے ان الفاظ میں فرمایا ہے: "ان لوگوں نے
شجرہ کو لے لیا اور ثمر کو ضائع کر دیا۔"

حزبِ چاکم نے یہ دیکھا کہ میری مادی سیاست بہت کمزور ہے۔ اس لیے کہ
اطرافِ مدینہ کہ جو مرکزِ اموال ہیں وہ اس وقت تک سر نہ جھکائیں گے جب تک مدینہ والے
انہیں باقاعدہ تسلیم نہ کریں حالانکہ مدینہ ابھی باقاعدہ ہموار نہیں ہوا۔

اگرچہ ابوسفیان وغیرہ نے اپنا ضمیر حکومت کے ہاتھ سپرد کیا تھا
لیکن پھر بھی حکومت کو یہ خطرہ تھا کہ یہ ضمیر پھر اس کے ہاتھ بک سکتا ہے جو اس سے
زیادہ دولت صرف کر دے۔ اور یہ کام علیؑ کے لیے بہت آسان تھا۔ لہذا ضرورت اس بات
کی تھی کہ علیؑ سے ان کے جملہ اموال چھین لیے جائیں تاکہ انصار کی قومیں حکومت وقت کے
ساتھ رہیں اور علیؑ اہلِ حرص و طمع کی کوئی جماعت تیار نہ کر سکیں۔

اس احتمال کو ذرا بھی بعید نہیں کہا جاسکتا جب تک یہیں حکومت
وقت کا مذاق اس بات کا ثبوت پہنچانا رہے گا اور جب تک یہیں اس امر کا علم رہے گا
کہ صدیق نے ابوسفیان وغیرہ کی آواز کو درہم و دینار اور ولایت دے کر خرید لیا تھا۔
چنانچہ تاریخ میں ہے کہ جب ابوسفیان کو ابو بکر کی خلافت کی خبر ملی تو اس
نے کہا مجھ سے کیا تعلق ہے۔ لوگوں نے کہا کہ تیرے لڑکے کو بھی حکومت ملی ہے تو وہ
راضی ہو گیا ہے۔

اب یہ بات قطعاً قابلِ تعجب نہیں رہ جاتی کہ حکومت وقت ان اموال کو
سلب کر لے کر جن سے علیؑ کے لیے پارٹی تیار کرنے کا احتمال تھا۔

یہ بات ہم صدیق کے لیے ہرگز عجیب نہیں سمجھ سکتے جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ
انہوں نے متعدد آوازیں مال کے ذریعے خریدی ہیں یہاں تک کہ انہیں کی ایک معاصر

عورت نے انہیں متہم کر دیا۔

چنانچہ تاریخ میں ہے کہ جب ابو بکر کے پاس اموال جمع ہوئے تو انہوں نے کچھ مال مہاجرین اور انصار کی غورقوں پر تقسیم کیا۔ اسی میں سے کچھ حصہ بنی عدی بن النجار کی ایک سونہ کو بھیا۔ اس نے پوچھا یہ کیا ہے؟

جواب ملا کہ خلیفہ وقت کی تقسیم!

وہ بول اٹھی: تم لوگ مجھے دین کے بڑے رشوت دینا چاہتے ہو میں اس مال کو اتھ بھی نہ لگاؤں گی۔ اور یہ کہہ کر واپس کر دیا۔

میں نہیں سمجھ سکتا کہ یہ اموال خلیفہ کے پاس کہاں سے آئے؟ جبکہ زکوٰۃ کا جمع شدہ تمام مال انہوں نے ابوسفیان کو ہیہ کر دیا تھا!

کیا اب بھی میں نہ کہوں کہ یہ رسول اللہ کا وہ باقی مال تھا

جس پر خلیفہ نے قبضہ کر لیا تھا اور جس کا فاطمہ زہرا مطالبہ کر رہی تھیں؟

میرا یہ خیال صحیح ہو یا غلط لیکن اس واقعہ سے اتنا ضرور معلوم ہو گیا کہ ہمارے جیسے احساسات اس وقت کے بعض اہل ایمان کے دلوں میں موجود تھے جیسا کہ سونہ نے اظہار بھی کیا۔

یہ بھی ناقابل فراموش بات ہے کہ اقتصادی حالات خلیفہ کو اس بات کی دعوت دے رہے تھے کہ حکومتی اموال میں حتی الامکان اضافہ کیا جائے تاکہ آئندہ آنے والی مہموں میں اس سے کام لیا جاسکے۔

اور شاید یہی وہ چیز تھی جس نے خلیفہ کو غصیبہ فدک پر آمادہ کیا۔ جیسا کہ عمرو ابو بکر کی گفتگو سے اندازہ ہوتا ہے کہ عمر نے فدک کی واپسی سے یہ کہہ کر متع کیا تھا کہ ابھی لشکر سازی میں مال کی ضرورت پڑے گی۔

ہیں سے ملکیت شخصی کے بارے میں دونوں خلفاء کی رائے بھی معلوم ہوجاتی ہے کہ اگر حکومت اپنے امور کو ترقی دینا چاہے تو افراد کے مال کو بلا معاوضہ لے سکتی ہے افراد کی ملکیت حکومت کی ضرورت کے وقت ختم ہوجاتی ہے۔

اور یہی رائے اکثر ان خلفاء کی رہی جو ابو بکر و عمر کے بعد تخت حکومت پر قابض ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ تاریخ ان کے ان اقدامات سے پُر ہو گئی۔ صرف فرق یہ ہے کہ بعد کے خلفاء نے یہ قانون تمام مسلمانوں کے اموال پر نافذ کیا اور ابو بکر نے صرف نبیؐ کے اموال پر۔

حاکم جماعت نے علیؑ کی دوسری طاقت (قرابت نبیؐ) کا علاج دو طریقوں

سے کیا :

① — قرابت رسولؐ کی کسی اہمیت کے قائل نہ رہے اور اس طرح خود ابو بکر کی خلافت کے اس شرعی پردہ کو بھی چاک کر دیا۔ جو اس پر سقیفہ میں ڈالا گیا تھا۔

② — اپنے سابق عقیدہ پر باقی رہے لیکن متضاد باتیں وقتی تقاضوں کی بنا پر کرنے لگے اور اس طرح نبی ہاشم کی قرابت کو اپنے مقابلہ سے ہٹ کر باقی حالات میں تسلیم کرنے لگے۔

حکومت وقت نے اپنی عزت سچانے کے لیے اپنے عقیدہ اہمیت قرابت کو باقی رکھ کر نبی ہاشم کو یہ کہہ کر دبا نا شروع کیا کہ لوگوں کی ہمت کے بعد حرف زنی ایک ناہائز فتنہ کی بنیاد ہے اور اس طرح نبی ہاشم کو خاموش کرنا چاہا اور اپنی اس چالاکی میں کامیاب بھی ہوئے۔

۱۔ خدا بھلا کرے خلیفہ سلیمین کا کہ حضرت فاطمہؑ کا سال غضب کر کے آج کی نام نہاد اسلامی حکومتوں کے لیے اشرکیت (مشرکوں) کا نظریہ چھوڑ گئے (مترجم)

ہم جب سیاستِ حاکمین وقت کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں بخوبی معلوم ہو جاتا ہے کہ ان لوگوں نے آل محمد کے مقابلہ میں ایسا سے ایک ہی روش اختیار کی تھی جس کا مقصد آل محمد کی قوتوں کو کم کرنا تھا اور بیتِ ہاشمی کا وہ قدیمی امتیاز جو انھیں نسلاً بعد نسل مل رہا تھا اسے ختم کرنا تھا۔

ہمارے پاس اس رائے پر حسبِ ذیل شواہد ہیں :

① — خلیفہ اور ان کے اصحاب کا علیؑ کے ساتھ سخت برتاؤ یہاں تک کہ عمر نے گھر میں باوجود فاطمہؑ زہراؑ آگ لگانے کی دھمکی دی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کی نظر میں فاطمہؑ کی اتنی حرمت بھی نہیں تھی کہ جوان لوگوں کو اس برتاؤ سے روک سکے۔ اس کا مظاہرہ اس وقت بھی ہوا جب ابو بکر نے علیؑ کو فتنوں کی آماجگاہ قرار دیا حالانکہ عمر نے اعتراض کیا تھا کہ رسولؐ ہم سے بھی ہیں اور علیؑ سے بھی۔

② — خلیفہ اول نے کسی جہم میں بنی ہاشم کو شریک نہیں کیا نہ ان کو کسی ایک ہاشمت زمین کا حاکم مقرر کیا۔ حالانکہ اس زمین پورے پورے ملک پر حاکم تھے۔ اس امر کا ایک قدیمی سائرس کا پیداوار ہونا اس گفتگو سے معلوم ہوتا ہے جو ابن عباس اور عمر کے درمیان ہوئی جس میں عمر نے اس امر کا اظہار کیا کہ اگر بنی ہاشم اطرافِ مملکت اسلامیہ کے حاکم ہو گئے تو خطرہ یہ ہے کہ یہ سلسلہ باقی رہ جائے گا اور خلافت کا رخ بدل جائے گا۔ جب یہیں عمر کی رائے سے یہ معلوم ہو گیا کہ اگر بنی ہاشم میں سے کوئی شخص کسی جزو حکومت کا

مالک ہو گیا تو وہ اپنی پوری حکومت قائم کرے گا اور خلافت پر قابض ہو جائے گا۔ اور ہم نے یہ بھی دیکھ لیا کہ وہ بنی امیہ بن ماکہ کوئی طریقہ حیات مقرر نہ تھا وہ زمانہ ابوبکر و عمر میں بڑے بڑے منصب کے مالک تھے اور ہم نے شوریٰ کی ترتیب سے یہ اندازہ بھی کر لیا کہ خلافت بنی امیہ کے رئیس عثمان ہی کو ملے گی تو ہمیں ایک بہت عظیم نتیجہ ہاتھ آگیا۔ اور وہ یہ کہ عمر و ابوبکر خلافت بنی امیہ کے اسباب برابر پیدا کر رہے تھے اور انھیں بخوبی معلوم تھا کہ بنی امیہ جو کہ بنی ہاشم کے قدیمی دشمن ہیں، ان کی کسی ایسی شخصیت کا نایاں کر دینا بنی ہاشم کو قیامت تک کے لیے ایک مقابل سے دست و گریباں کر دینا ہے اور اس طرح بنی ہاشم سے ہماری شخصی عداوت ایک قومی عداوت کا رنگ اختیار کر لے گی اور پھر یہ مقابلہ اس طرح وسیع ہوتا جائے گا۔ اس لیے کہ اس کا تعلق ایک شخص سے نہیں بلکہ ایک قوم سے ہے جس کے نتیجہ میں بنی امیہ کی حکومت میں وہ استحکام پیدا ہو جائے گا کہ بنی ہاشم اسے قیامت ختم نہیں کر سکتے۔

③ — خلیفہ کا خالد بن سعید بن عباس کو قیادت میں سے معزول کر دینا صرف اس بات پر کہ عمر نے انھیں اس کی تباہی محبت پر مطلع

۱۔ قضیہ شوریٰ کا یہی وہ سیاسی راز ہے جس سے محققین نے غفلت برتی ہے۔ اس لیے کہ روایت میں ہے کہ عمر نے تمام اہل شورے کو مساویہ سے ڈراتے ہوئے یہ کہا تھا کہ عنقریب وہی مالک امور اور حاکم سلطنت ہوگا۔ شرح نہج البلاغہ ج ۱ ص ۶۲۔ یہ کلام اگر ہوشمند بنی عمر پر دال ہے تو سیاسی چالوں پر اول۔

کر دیا جو اسے آل محمد سے سختی اور اس کے وہ مجاہدات یاد دلانے
جو کہ اس مرویدان نے بعد وفات رسولؐ ان کے مقابلے میں
کیے تھے۔

اگر ہم اس موضوع کو طول دینا چاہیں تو اس میں قصہ شوریٰ کا بھی اضافہ
کریں گے کہ جہاں عمر نے علیؑ کو ان پانچ اشخاص کے برابر کر دیا جن کو روحانیت و فورانیت
کے اعتبار سے علیؑ سے کوئی نسبت نہ تھی۔ یہی وہ زبیر ہیں کہ جنہوں نے وقت وفات پیغمبرؐ
مستحق خلافت صرف علیؑ کو سمجھا تھا لیکن عمر نے انہیں مقابل قرار دے کر اور حکومت کا
لاپنج و لا کر ایسا دریائے بنادیا کہ یہ فکر ان کے ذہن سے بالکل جاتی رہی۔
خلاصہ امر یہ ہے کہ،

حزبِ حاکم کا مقصد صرف یہ تھا کہ بنی ہاشم کو عام انسانوں کے
براہت قرار دے کر ان کا وہ خصوصی رشتہ جو انہیں رسولؐ سے حاصل تھا اسے بے وقار
بنادیا جائے۔

اگر حکام نے یہ سمجھ بھی لیا ہو کہ علیؑ اس وقت ہمارے مقابلہ میں انقلاب
نہیں کریں گے جب بھی وہ اس امر سے قطعاً مطمئن نہیں تھے کہ وہ آئندہ کوئی اقدام
نہیں کریں گے۔ اس لیے ضروری تھا کہ جنگ قائم ہونے سے پہلے ہی علیؑ کی مادی
اور منوی قیمت کو گھٹا دیا جائے۔

فدک میں موقوف خلیفہ اور طرزِ مخالفتِ آلِ محمدؐ

اب یہ بات سمجھ میں آگئی کہ خلیفہ کو قضیہ وراثت میں فاطمہؑ کے خلاف ایسا ہی
قیام کرنا چاہیے تھا۔ اس لیے کہ اس نقطہ پر دو غرضوں کا اتنا دہر رہا تھا۔ ایک طرف

فدک تھی کہ فدک کو چھین کر ان کی مادی قوت کم کر دی جائے اور دوسری طرف خیال تھا کہ فاطمہ کی توہین کر کے آل محمد کا وقار گھٹا دیا جائے۔

ورنہ پھر کون سی شے فدک دینے سے مانع تھی جبکہ فاطمہ نے خود ہی وعدہ کیا تھا کہ اس کے منافع کو مصالح مسلمین پر صرف کریں گی۔ شاید خلافتِ دلت نے محسوس کیا ہو کہ فاطمہ کی مراد مصالح مسلمین سے اپنے شوہر کی خلافت ہے ورنہ مال مسلمین ہی سمجھ کر کچھ فاطمہ کو دے دیا جاتا جبکہ صحابہ اس سے راضی تھے۔

جب ہمیں یہ معلوم ہو گیا کہ فاطمہ کا وجود ان کے شوہر کے لیے بہترین سند تھا اور یہ ایک ایسی دلیل تھی جس کے سامنے جملہ انصار سر جھکا دیتے تھے تو یہ بھی واضح ہو گیا کہ نزاکتِ وقت کے لحاظ سے خلیفہ کو فاطمہ کا سخت مقابلہ کرنا چاہیے تھا تاکہ مسلمانوں پر یہ امر واضح کر دیا جائے کہ فاطمہ عورت ہے اور عورت کی رائے کا معمولی ساں میں بھی کوئی وزن نہیں ہوتا چہ جائیکہ اہم مسائل میں اور یہ بھی لوگوں کو سمجھا دیا جائے کہ فاطمہ ایک زمین کا ناحق دعویٰ کر سکتی ہیں تو خلافت کا دعویٰ بھی ان کے لیے ایسا ہی ہوگا۔

ان ابحاث کے بعد ہم غصبِ فدک کی دو توجیہیں کر سکتے ہیں :

- ① — خلیفہ کے اقتصادی حالات تھے انہیں مجبور کر دیا تھا۔
- ② — ابو بکر کو خوف تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ علیؑ منافعِ فدک کو صرف کر کے اپنی حکومت قائم کر لیں۔

اسی طرح فاطمہ سے اس سخت مقابلہ کی بھی دو وجوہات ہو سکتی ہیں :

- ① — خلیفہ کے کچھ نفسانی جذبات تھے جو ان کے دل میں تڑپ رہے تھے جس کے اسباب ہم بیان کر چکے ہیں۔
- ② — یہ ایک طویل و عریض سیاست تھی جس کو ابو بکر نے جلد ہی ہاشم

کے مقابلہ کے لیے اختیار کیا تھا، جیسا کہ واضح کیا گیا۔

امام کا حزبِ حاکم سے عظیم مقابلہ

امیر المومنینؑ کی زندگی کا سب سے بڑا کا نامہ راہِ اسلام میں وہ قربانی اور ذاتِ احدیت سے وہ اخلاص ہے جس کی بنا پر انھوں نے جملہ شخصی امتیازات کو ختم کر کے ایک ایسی بلند حقیقت کی بنیاد قائم کر دی جو حیاتِ عقیدہ تک باقی رہے گی۔ اس شہرِ بانی کا نظاہر و میدانِ شوریٰ میں کیا گیا۔ جہاں علیؑ نے ذاتِ خالق میں فنا ہونے کی ایک اعلیٰ مثال قائم کی۔

رسول اکرمؐ نے ایک طرف بُت پرستی کی گمراہیوں کا قلع قمع کیا اور دوسری طرف اپنے حقائق اور مہارت کے فیضان سے علیؑ میں وہ میداری پیدا کر دی کہ جس کی وجہ سے حیاتِ انسانی کی مرکزی خواہشات مکرنا ہو گئیں لیکن ایمان و عقیدہ ہمیشہ کے لیے زندہ رہ گئے۔ اور علیؑ کی زندگی بھی انہیں کی حیات سے وابستہ ہو گئی۔

اگر انسانیت کی راہ میں قربانیوں کی ترتیب کے لیے کوئی کتاب لکھی جائے تو علیؑ کا نام اس کی دائمی سرخی ہو گا۔

اگر تواریخِ سماویہ کی کوئی عملی تفسیر ہو سکتی ہے تو وہ ذاتِ علیؑ ہے۔

نے ارشاد رسول اکرمؐ "علی مع الحق والحق مع علی" علی حق کے ساتھ ہے اور حق علی کے ساتھ ہے۔ ان دونوں میں تاقیامت جدائی نہیں ہو سکتی۔ ملاحظہ ہو تاریخِ بندگان خطیب ج ۱۲ ص ۳۲، تفسیر رازی ج ۱ ص ۱۱۱، کفایۃ الطالب گنجی ص ۱۳۵، مناقب اخطب خوارزم ص ۴۴، پیغمبر نے یہ بھی دعا کی "بار اہل حق کا رخ ادھر موڑ دے جدھر علی پھریں" مستدرک حاکم ج ۳ ص ۱۴۵، کنز العمال ج ۶ ص ۴۵، ترمذی ج ۲ ص ۲۱۴، ارشاد نبی کریمؐ "علی کی ضربت عبادتِ ثقلین سے افضل و برتر ہے" مستدرک حاکم ج ۳ ص ۲۲

جو اقیامِ قیامت تو اہل البیہ کی حکایت کرتی رہے گی۔

اگر پیغمبر نے امت میں قرآن و علیؑ کو چھوڑا ہے تو صرف اس لیے کہ قرآن و علیؑ کے کارناموں کو بیان کرے اور علیؑ، قرآن کے عمل نمونے پیش کریں ایسے اگر اللہ نے علیؑ کو نفع رسول قرار دیا ہے تو صرف یہ بتانے کے لیے کہ حیاتِ پیغمبرؐ، حیاتِ علیؑ کی صورت میں جاری رہے گی اور علیؑ کے پہلو میں وہی دل ہے جو نبیؐ کے سینے میں تھا۔ ۲۵

اگر نبی اکرمؐ مکہ سے علیؑ کو بستر پرٹا کر نکلے تو صرف یہ بتانے کے لیے کہ ہماری حیات کی راہیں ہمارے خالق کی طرف سے متعین ہوتی ہیں۔

اگر سئلہ انبیاء یہ چاہتا ہے کہ کوئی شخص اسے نمایاں کرے اور کوئی اس کی راہ میں قربان ہو تو نبیؐ کی ہجرت اور علیؑ کی قربانی کی شدید ضرورت بنتی۔

اگر وحیِ سماوی نے صرف علیؑ کے لیے مسجد میں جانا خاص حالات میں جائز قرار دیا ہے تو اس کا مطلب صرف علیؑ و مسجد کی یکسانیت ہے کہ مسجد و تیبائے مادہ میں رمز الہی ہے اور علیؑ عالم عقیدہ و روحانیت میں۔

اگر آسمان سے علیؑ کی مدح لافنی تھے کہہ کر کی تو صرف اس لیے کہ علیؑ ہی کی طاعت قرآن کا وقار قائم کر سکتی ہے اور اسی کی مردانگی تک انسان کی

سے حدیث ثقلین، صواعقِ محرقہ ص ۱۳۶ (عقبات الانوار، حدیث ثقلین)

۲۵ تفسیر رازی، آیت مبارکہ اسباب النزول واحدی ص ۵۵

۲۶ سند احمد ج ۳ ص ۳۱۶، مستدرک حاکم ج ۳ ص ۱۳۵، شرح نہج البلاغہ ج ۲ ص ۲۴۳، تذکرہ

ابن جوزی، مناقب خوارزمی، تاریخ الخلفاء، سیوطی، صواعق ابن حجر، فضائل نسائی۔

۲۷ تاریخ طبری ج ۳ ص ۱۰۱، سیرت ابن ہشام، شرح نہج البلاغہ، مناقب خوارزمی۔

قوتیں اور اس کا اخلاص نہیں پہنچ سکتا۔

یہ زمانہ کا مذاق تھا کہ جن فتوحات کی مدح آسمان سے کی جائے انھیں کو علیؑ کے فقائے میں شمار کیا جائے۔ اور ان کو اس ابو بکر سے گھٹا دیا جائے جس نے دنیا میں ان سے زیادہ اتنی ہی زندگی کی جس میں وہ کفر و شرک کی آماجگاہ تھا۔

میں نہیں سمجھ سکتا کہ وہ ذات جو کفر و اسلام کا سنگم تھی کیوں کہ مقدم ہوگی اس مستی پر جس کی ابتدا اعلانِ توحید سے اور انتہا سجدہٴ بندگی پر ہوئی۔

حضرت علیؑ کی یہی مرکزی حیثیت وہ تھی کہ جس کے اعتراف سے خود حضرت عمر بھی محفوظ نہ رہ سکے۔ بلکہ انھیں اعلان کرنا پڑا: "لولا علیؑ لہلک عمر" اور اسی طاقنت کا ٹھہورا اس وقت ہوا جب مسلمان علیؑ کے پاس جمع ہو کر انھیں خلافت پر مجبور کرنے لگے۔ ایسے اجتماع کے ساتھ کہ جس کی تاریخ میں نظیر کم ملتی ہے۔

ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ علیؑ اپنی سماوی طاقت کی بنا پر اسلام کی ضروریات میں سے ایک ضرورت تھے اور یہ وہ آفتاب تھا جس پر فلکِ اسلامی کی گردش موقوف تھی۔

حالاتِ زمانہ نے یہ بات بالکل واضح کر دی کہ سیاستِ وقت میں فوری انقلاب پیدا کرنا ایک غیر ممکن سی بات تھی اس لیے کہ یہ بات شخصیتِ امامؑ کے منافی بھی تھی جس کا قہری نتیجہ یہ تھا کہ سیاستِ وقت ٹیڑھی راہ اختیار کرے۔ یہاں تک کہ اس نقطہ پر پہنچ جائے جہاں تک کہ امویین نے اسے پہنچایا۔ اس کے بعد تو خود راہِ راست

نے اس بیان کی روشنی میں رسولِ اکرمؐ کے اس فقرہ کے معنی سمجھیں جو آپ نے جنگِ تبوک میں جاتے ہوئے فرمایا تھا: "یا علیؑ! یا میں رہوں یا تم رہو" ملاحظہ ہو خصائصِ نساۃ ص ۷۷

سند احمد ج ۱ ص ۲۳۱، مناقب خوارزمی ص ۷۷، زمار العقبیٰ ص ۷۷

پر آجائے گی جس طرح کہ گاڑی جب راہ سے منحرف ہو جاتی ہے تو اسے کچھ ہو کر راستہ پر آنا پڑتا ہے۔

حیاتِ علوی کا یہ وہ مضمون ہے جو انتہائی تفصیل کا طالب ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ علیؑ کی اس سیاست کو خوب واضح کیا جائے کہ انھوں نے کس طرح حکومتِ وقت کی مخالفت کی اور اسی کے ساتھ اس کو براہ راست پر بھی لگا دیا۔

اگر امامؑ کے جملہ اقدامات ایک نمایاں حیثیت رکھتے ہیں تو خلافت میں آپ کا اقدام اور بھی بلند درجہ رکھتا ہے۔

امامؑ کا سکوت اور حادثہ سے احتجاج نہ کرنے کے اسباب

اگر عقیدہ الہیات ایک ایسا مجاہد چاہتا ہے جو اس پر اپنی جان قربان کرے تو اسے ایک ایسے انسان کی بھی ضرورت ہے جو اس مشرانی کے مقصد کی ترویج کرے۔ اسی کام کے لیے خدا نے نبیؐ و علیؑ کا انتخاب کیا تھا۔ ایک نئے فرسِ نبیؐ پر مشرانی دی اور دوسرے نے مدینہ میں الہیات کی ترویج کی۔ امام علیؑ کے لیے یہ بات بعد وفاتِ نبیؐ بالکل ناممکن تھی اس لیے کہ اگر وہ حکومتِ وقت کو براہ راست پر لانے کے لیے اپنی جان قربان کر دیتے تو دوسرا کون ہوتا جو ان قوانین کو تقویت پہنچاتا اور ان کی ترویج کرتا۔ سب طین سپینیر اگرچہ موجود تھے لیکن بوجہ کم سنی وہ مادی طور پر اتنا بڑا اقدام نہ کر سکتے تھے۔

علیؑ حکومتِ وقت کے خلاف ایک دوراہے پر کھڑے تھے

جس کی دونوں راہیں خطرناک تھیں:

- ① — ابو بکر کے خلاف مسلح انقلاب کی ہم چلا دیں۔
- ② — جملہ مصائب و آلام کو برداشت کر کے خاموش ہو جائیں۔

اگر انقلاب کرتے تو اس کے نتائج کیا ہوتے۔ اس کو ہم تاریخ کی روشنی میں آئندہ واضح کریں گے۔

ظاہر ہے کہ حکام وقت معمول مقابلہ سے تاج و تخت سے دستبردار نہیں ہو سکتے تھے۔ اس لیے کہ مسئلہ خلافت میں وہ بہت حریص و طماع تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی حکومت کے استحکام کے لیے پورا پورا مقابلہ کرتے۔ اور اس وقت یہ امکان بھی تھا کہ سعد بن عبادہ اپنی حکومت کے لیے ایک دوسری جنگ کھڑی کر دیتے جیسا کہ انھوں نے طالبینِ بعیت سے علی الاعلان کہہ دیا تھا :

"میرے ترکش کے تمام تیر جب تک ختم نہ ہو جائیں گے
اور میرے نیزے جب تک رنگین نہ ہو جائیں گے، میری تلواریں
جب تک کام کریں گی، میرے اہلبیت و انصار جب تک میرا
ساتھ دیں گے، میں تمہاری بعیت نہ کروں گا۔"

میرا خیال ہے کہ اس وقت انھوں نے اپنے پاس جنگ کی قوت نہیں دیکھی، اس لیے صرف تہدید و تخویف پر اکتفا کر لی۔ اور اس بات کے منتظر رہے کہ امور حکومت میں کچھ تنزلی ہو جائے تو تلوار نیام سے کھینچیں۔ پھر ایسے وقت میں انھیں حق تھا کہ ان کی غیرت و حمیت کو جوش آئے اور ان کا خوف جاتا رہے اور اس طرح وہ حکومت وقت کو ضعیف سمجھ کر ایک نئی جنگ قائم کر دیں۔ اور اپنی تلوار سے ہاجرین کو مدینہ سے نکال باہر کر دیں۔ جیسا کہ انھوں نے سقیفہ میں اعلان کیا تھا۔

ہم اس وقت بنی امیہ کو فراموش نہیں کر سکتے کہ وہ جاہ و حشم کے کس قدر دلدادہ تھے اور جبکہ آخری دور میں انھیں مکہ میں کچھ تصرف بھی حاصل ہو گیا تھا

لے اس صورتحال کی روشنی میں واضح ہے کہ اگر علی کوئی اقدام کرتے تو وہ نتیجہ خیز نہ ہوتا۔

اسی لیے تو ابوسفیان اسلام کے خلاف ہر جنگ میں آگے آگے رہتا تھا اور عتاب ابن اسید بھی رئیس بنا رہتا تھا۔

جب ہم تاریخ میں یہ واقعہ دیکھتے ہیں کہ جس وقت خبر وفات پیغمبر کے میں پہنچی تو آپ کا عامل عتاب بن ابی العاص بن امیہ مخفی ہو گیا اور شہر میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ یہاں تک کہ قریب تھا کہ اہل مکہ مرتد ہو جائیں۔ ہمیں وہ توجہ میں پسند نہیں آئیں جو لوگوں نے اس واقعہ میں کی ہیں۔ اور نہ ہم اس بات کو مان سکتے ہیں کہ وہ لوگ ارتداد سے صرف یہ خیال کر کے رک گئے کہ ابوبکر جب حاکم ہو جائیں گے تو ہم لوگ بھی مدینہ پر غالب آجائیں گے۔

اس لیے کہ خلافت ابوبکر روزِ وفات پیغمبر طے ہوئی ہے اور ظاہر ہے کہ دونوں خبر میں مکہ ایک ساتھ پہنچی ہوں گی۔

بلکہ میرا خیال قوی یہ ہے کہ عتاب نے حالات کا جائزہ لینے کے لیے اپنے کو مخفی کر دیا ہو گا۔ اور پھر حیب اسے یہ معلوم ہو گیا کہ ابوسفیان نے جی امیہ کے مصالح کی بنا پر حکومت وقت کو تسلیم کر لیا ہے تو ظاہر ہو کر اس نے امورِ حکومت سنبھال لیے جس سے مسلم ہوتا ہے کہ بنی امیہ میں ایک سلسلہ اس وقت قائم ہو چکا تھا۔ ہم اپنے اس خیال کی تائید ابوسفیان کے ان اقوال سے کر سکتے ہیں جو اس نے ابوبکر کے خلاف کہے تھے جن کا ماحصل یہ تھا کہ اس گرد کو سوائے خون کے کوئی دوسری چیز سبھا نہیں سکتی۔

اور علیؑ اور عباس کے بارے میں اس نے کہا: "ہم ان کے شانے پکڑ کر انہیں بلند کریں گے۔" اس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ امویین اس وقت انقلاب کے لیے تیار تھے۔

اور جب حضرت علیؑ کے سامنے یہ مسئلہ پیش ہوا تو انھوں نے اس کی شرارت کو تار لیا آپؑ پر یہ بات واضح تھی کہ اس کی بات کا کوئی اعتبار نہیں ہے، اسی لیے انھوں نے اس کی طلب کو ٹھکرا دیا۔ صرف یہ خیال کر کے کہ اگر میں نے کوئی اقدام کیا تو یہ لوگ اپنے مصالح کو نہ حاصل ہوتے ہوئے دیکھ کر مخالفت کریں گے اور ان کی مخالفت دین سے روگردانی تک منتہی ہوگی اور اس طرح مکہ و مدینہ میں ایک خلیج حائل ہو جائے گی۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ علوی انقلاب ایک خونی انقلاب ہوتا جس کی پشت پر ہزاروں انقلابات تھے اور ایسے حالات سے منافقین اور مخالفین اسلام کو بڑے فائدے حاصل ہوتے۔

حالات اس قسم کے نہیں تھے کہ علیؑ تنہا اپنی آواز بلند کریں اور باقی آواز نہ دے دے کر رہ جائیں، بلکہ اس کے عوض میں بڑی آوازیں بلند ہوتیں اور مختلف جنگیں ظہور میں آئیں اور ایسے سخت وقت میں اسلامی وقار تباہ و برباد ہو کر رہ جاتا۔ جب کہ اسلامی اجتماع کی شدید ضرورت تھی اور مسلمانوں کو آئندہ آنے والے خطرات کے مقابلہ کے لیے پورے پورے اسباب کی احتیاج تھی۔

وہ علیؑ کہ جس میں راہ خدا میں شہرانی کی پوری استعداد اس وقت سے موجود تھی جب وہ خانہ کعبہ میں متولد ہوئے اور اس وقت تک رہی جبکہ خانہ خدا میں شہید ہوئے۔ انھوں نے اپنی حقیقی منزل اور اپنے الہی منصب کو صرف اس بات پر قربان کر دیا کہ اسلامی وقار نگھٹنے پائے۔

یہ اور بات ہے کہ اس طرح محمدیؐ پیغام کے بعض اجزاء تشنہ تبلیغ رہ گئے، اس لیے کہ دعوت ذوالعشیرہ میں نبی عبدالطلب کو جمع کر کے جس طرح رسولؐ نے اپنی رسالت کا یہ کہہ کر اعلان کیا تھا کہ مجھ سے بہتر پیغام دنیا کا کوئی جوان نہیں لایا اسی طرح علیؑ کی فلانت کا اعلان ان الفاظ میں کیا تھا کہ یہ میرا بھائی — وصی اور

اور کیفیات موجودہ نے علیؑ کو یہ چل بتایا کہ نصوص کے پیش کرنے سے ایک مدت خاص تک خاموشی اختیار کریں۔

اس دور کے تشویشناک حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر علیؑ نصوص مقدسہ کو پیش کر کے ان سے احتجاج کرتے تو اس کا نتیجہ بڑا خراب ہوتا۔ اس لیے کہ اس وقت حق و باطل کے امتیاز کا پیمانہ سیاسی افکار اور مضطرب خواہشات کو قرار دے دیا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ نصوص سنیہ سے وہی لوگ واقف تھے جو مدینہ کے رہنے والے تھے اور یہ کلمات ان کے پاس بطور امانت محفوظ تھے جو عوام الناس تک انہیں کے ذریعے پہنچنے والے تھے۔ لہذا اب اگر امام انہیں روایات سے احتجاج کرتے اور انہیں لوگوں کے سامنے بطور دلیل پیش کرتے تو اس کا فطری نتیجہ یہ ہوتا کہ مخالفت جماعت صدیقہ است کی تکذیب کرتی اور ان نصوص کا شدت سے انکار کرتی اور اس طرح کلام رسالت کا وقار مٹ جاتا اور لوگ دین سے خارج ہو جاتے۔

بہت ممکن ہے کہ علیؑ کی آواز میں اتنی طاقنت نہ ہوتی جو اس نقارخانہ میں کارگر ہو سکے، اس لیے کہ اکثر قریش یعنی بنی امیہ تو خود ہی سلطنت کے طالب تھے اور انہیں یہ معلوم تھا کہ نصوص کی بنیاد پر کسی کو مقدم کر دینا مذہب امامیہ کی اساس کو مستحکم کر دینا ہے۔ اور اگر یہ نظریہ مسلمانوں کے دماغ میں راسخ ہو گیا تو حکومت آل محمدؑ میں منحصر ہو کر رہ جائے گی اور ہم ہمیشہ کے لیے اس سے محروم ہو جائیں گے۔

اس بات کا اندازہ بس عمر کے اس کلام سے ہوتا ہے جو اس نے ابن عباس سے علیؑ کو خلافت نہ دینے کے عذر میں پیش کیا تھا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ "قوم خلافت و شہرت کو ایک گھر میں نہیں دیکھنا چاہتی ہے"۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پہلے دن علیؑ کو خلافت دے دینا ہمیشہ کے لیے

بھی اٹھم میں منحصر کر دینے کے مرادف ہے۔ اس کی کوئی وجہ سوائے اس کے نہیں ہو سکتی کہ جمہور کی نظر میں یہ قانون بن جانا کہ خلافت کا منصب آسمان سے ملنا چاہیے، انتخاب عوام سے کوئی فائدہ نہیں۔

لہذا اگر تشریح علیؑ کی جنگ میں مدد بھی کرتے تو سداً نص میں تو بہر حال ساتھ نہ دیتے جب علیؑ یہ کہتے کہ :

”رسول اکرمؐ نے یہ فرمایا ہے کہ میں دو چیزیں چھوڑ
جانا ہوں۔ ایک قرآن دوسرے اہلبیت۔“

رہ گئے انصار، تو انھوں نے نصوص کی توہین اسی وقت کر دی تھی جب سقیفہ بنی ساعدہ میں حکومت کی طمع نے کہ پہنچ گئے تھے تاکہ کسی کو اپنا رئیس بنا لیں۔

اب اگر علیؑ روایات پیش کرتے تو اس مجمع سے کون گواہی دیتا۔ جب کہ وہ جانتے تھے کہ علیؑ کی تصدیق کرنا ایک متضاد منطلق میں مبتلا ہونا ہے اور یہ بات اپنے لیے کوئی شخص قبول نہیں کر سکتا خصوصاً ایسے وقت میں۔

اگر کوئی یہ کہے کہ ان لوگوں کا یہ کہنا کہ ہم غیر علیؑ کی بیعت نہ کریں گے۔ یہ بھی تو ایک تضاد ہے۔ تو یہ غلط فہمی ہوگی۔ اس لیے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ خلافت انتخابی چیز ہے۔ ہم علیؑ کو چھوڑ کر ابو بکر کو منتخب نہ کریں گے، اس کا مطلب نصوص کو قبول کر لینا ہرگز نہیں ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ :

پھر ہاجرین کی بات کیوں مان لی ؟

تو اس کا جواب واضح ہے اور وہ یہ کہ انصار نے پہلے سے کوئی خاص بات طے نہیں کی تھی بلکہ وہ تو ایک مشورہ کر رہے تھے جیسا کہ حساب بن منذر کی

اس سخت گفتگو سے اندازہ ہوتا ہے جو انہوں نے ہجرت کے خلاف کی تھی اور جس سے اجتماع میں ایک ہلچل مچ گئی تھی۔
حاصل کلام یہ ہے کہ

امامؑ نے یہ اندازہ کر لیا تھا کہ روایات کا اظہار کرنا، حاکم جماعت کو اس کے انکار پر آمادہ کرنا ہے اور پھر اس وقت میں میری تائید کرنے والا بھی کوئی نہیں ہے۔ اس لیے کہ بعض لوگ تو وہ ہیں جنہیں خواہشاتِ نصوص کی عملی مخالفت پر آمادہ کر رہی ہیں اور بعض وہ ہیں جو خیال کرتے ہیں کہ نصوص کی تائید کر دینا خلافت کو نبی مہتمم کے نام و وقت کر دینے کے مرادف ہے۔

اب جبکہ حکومت اور اس کے انصار نے مخالفت کی ٹھان لی ہے اور باقی نے سکوت اختیار کر لیا ہے تو روایات کا سنانا ان کی معنوی عظمت کا گھٹانا ہے اور دلائلِ امامت کو حقیقتاً تباہ کرنا ہے۔ پھر ظاہر ہے کہ مدینہ کے باہر والے سب انکار ہی کرتے، اس لیے کہ ان کا دار و مدار مدینہ پر تھا۔ اور مدینہ اسی انکار پر تلا ہوا تھا جس پر اسے خواہشات مجبور کر رہی تھیں۔

اگر ہم فرض بھی کریں کہ ایک نہ ایک جماعت علیؑ کی تائید میں بھی پیدا ہو جاتی جو ان کے نصوص کی شہادت دے کہ حکومت وقت کے انکار کا صحیح مقابلہ کرتی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ حکومت کی نظر میں چپڑھ جاتی اور وہ سلطنت جو اپنی شخصیت بنانے کے لیے پوری کوشش کر رہی ہے انہیں ازیت دینے پر آمادہ ہو جاتی اور آہستہ کار ایک جنگ کھڑی ہو جاتی جس کی مادی قوت فی الحال علیؑ کے پاس موجود نہ تھی، جیسا کہ ہم نے ثابت کر دیا۔

نصوص و احادیث سے احتجاج کا ایک اثر یہ بھی ہوتا کہ سیاست حاکم وہ تمام راہیں اختیار کرتی جن سے ذہنیتِ اسلامی سے احادیثِ نبویہ کو محو کر دیا جائے۔

اس لیے کہ اسے معلوم تھا کہ خلافت حاضرہ کے خلاف مخالفت کے پاس ہی بہترین قوت ہے اور یہی قوی ترین اسلحہ۔

میرا خیال ہے کہ اگر عمر کو روایات کے ان تمام خطرات کا اندازہ ہو جاتا جو نبی امیرؐ کو پیش آئے جب روایات ان کے سامنے پیش کی گئیں تو پہلے ہی ان کی جڑیں کاٹ دیتے اور اس چسپاں کو پہلے ہی خاموش کر دیتے۔
امامؑ کی نظر میں یہی انجام تھا۔

اسی لیے انھوں نے ان روایات کو چھپا لیا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ سیاستِ وقت انھیں آج ہی کھلونا بنا دے اور پھر آئندہ انھیں پیش کرنے کا موقع باقی نہ رہے۔ اسی لیے امامؑ نے دوسروں کی توجہ کو اس طنز سے موڑ دیا۔ حالانکہ عمر خود بھی حکمِ رسولؐ سے انھیں دلی المومنین کہا کرتے تھے۔

اس کے علاوہ امامؑ کو اپنے بھائی کی کرامت کا بھی خیال تھا کہ مخصوص کے ساتھ اس کی بھی توہین ہوگی۔ حالانکہ وہ ان کے نزدیک دنیا کی غنیمت ترین ہستی تھی۔

ابھی تو امامؑ کی نظر میں وہ منظر بھی ہے جب ان کے بھائی نے قلمِ دو دوات طلب کیا تھا اور صحابی نے انھیں ہدیان گو کہہ دیا تھا، جس کے متعلق عمر نے ابن عباس سے اعتراض بھی کیا کہ وہ علیؑ کو خلیفہ بنانا چاہتے تھے۔

ایسے حالات میں وہ روایات کیونکر سناتے؟

میں یہ نہیں کہتا کہ رسولؐ، علیؑ کو وصی ہی بنانا چاہتے تھے۔ مجھے تو صرف یہ بتانا ہے کہ وہ صحابی جو پیغمبرؐ کی رو بردِ مخالفت کر سکتا ہے، انھیں حالِ حیات

سے ظاہر ہے کہ جس کی نظر میں پیغمبرؐ کے سامنے ان کے ارشادات کا کوئی وزن نہ تھا وہ انتقال کے بعد ان فریقین کی کیا قیمت لگاتا۔ (مترجم)

میں دیوانہ کہہ سکتا ہے جس کی مخالفت قرآن و اسلام دونوں نے کی ہے۔ کیا اس میں اتنی جرأت نہ تھی کہ روایات کو سُن کر کہہ دیتا کہ یہ پیغمبر کی طبعزاد ہیں۔ ان کو وحی الہی سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ بلکہ اس کا احتمال زیادہ قوی ہے۔

اس لیے کہ پیغمبر کی تحریر سے اتنے خطرات نہ تھے متنبہ علیؑ کے روایات کو سنا دینے سے پیش آنے والے تھے۔

اگر پیغمبر وقتِ آخرِ نبض کو صحابی کے قول کی بنا پر چھوڑ سکتے ہیں تو علیؑ بھی نبض کو صحابی کے آئندہ اقوال کے احتمال کی بنا پر چھپا سکتے ہیں۔ میری بحث کا نتیجہ یہ ہوا کہ علیؑ ایک خاص وقت تک نصوص کے اظہار سے حسب ذیل امور کا تدارک کر رہے تھے۔

① — اس وقت ایسے لوگ موجود نہ تھے جن کی شہادت پر علیؑ کو اطمینان ہوتا۔

② — نصوص کو پیش کرنا جماعتِ سالم کو ان کی قدر و قیمت کی طرف متوجہ کرنا تھا اور اس طرح ان کی توہین ہو جاتی۔

③ — نصوص سے احترازی کرنا ایک بڑے انقلاب کے لیے آمادہ ہونا تھا جس کے لیے علیؑ نطفاً تیار نہ تھے۔

④ — عمر کے، آخر وقت میں نبیؐ کو متہم کر دینے سے علیؑ پر یہ بات بالکل واضح ہو گئی تھی کہ یہ جماعت اپنے مقصد کو حاصل کرنے

کے لیے اور اپنی حکومت جمانے کے لیے ہر دینی اور مذہبی قدر کو بھینٹ چڑھا سکتی ہے اور اس طرح عظمتِ رسولؐ کی دوبارہ اہانت کا اندیشہ تھا۔



مطالبتہ فدک سیاستِ علوی کا اعلیٰ ترین کارنامہ ہے

امامؑ نے آج تک کا ایک قطعی فیصلہ کر لیا اور وہ یہ کہ نہ کوئی انقلاب کریں گے اور نہ علی الاعلان اس وقت تک کوئی روایت پیش کریں گے جب تک لوگ ابو بکر و عمرو عثمان کے خلاف شہادت دینے کے قابل نہ ہو جائیں۔

اسی لیے علیؑ نے حفصہ زعماءِ مسلمین اور رؤساءِ مدینہ کے دروازوں پر جا کر انہیں موعظہ کرنا شروع کر دیا۔ انہیں عذابِ الہی سے ڈرانے لگے اور ان کے ساتھ ان کی شریکہ حیات بھی تھیں جو ان کے خاموش جہاد کی قیادت کر رہی تھیں۔

ظاہر ہے اس سے علیؑ کا مقصد لشکر کی جمع آوری نہ تھا۔ اس لیے کہ علیؑ کے نام کو انصار نے پہلے بھی پیش کیا تھا۔ بلکہ مقصد صرف یہ تھا کہ خونِ خدا کے احساس سے رائے عامہ میرے ساتھ ہو جائے۔

اب مسئلہ فدک اٹھنا ہے جسے سیاستِ علوی میں صدارت کی جگہ حاصل ہے اس لیے کہ وہ فاطمی اقدام کہ جس کے خطوط اور نذرینت نے ستین کیے تھے اس شہانہ گردش سے بالکل متحد تھے جس میں فاطمہ شریک رہتی تھیں۔ اب گردشِ فاطمی اس بات کی سزاوار تھی کہ خلافت کا رخ بدل جائے اور خلافتِ صدیق کا یونہی خاتمہ کر دے جیسے آنکھ کھلتے ہی خواب کی انتہا ہو جاتی ہے۔

گردشِ فاطمی کا خلاصہ یہ ہے کہ صدیق سے اپنے مقصودِ اموال کا مطالبہ کرے اور اسی طرح اس اساسی مسئلہ پر بھی اعتراض ہو جائے اور لوگوں پر واضح ہو جائے کہ انھوں نے علیؑ کو چھوڑ کر ایسے شخص کو اختیار کیا ہے جو ہوس کا بندہ اور خواہشات کا غلام ہے اور سچے قرآن و سنت کی صریح مخالفت کرتا ہے۔

جب یہ فکر فاطمہؑ کے ذہن نشین ہو گئی تو وہ اٹھیں، اس ارادہ سے کہ حالاتِ وقت کی اصلاح کریں اور حکومتِ اسلامی جس کی بنیاد سقیفہ میں پڑی ہے، کے رُخ سے وہ گرد وھودیں جس سے چہرہٴ اسلام اکودہ ہو گیا ہے۔
 اور اس کا بہترین ذریعہ ہے کہ حکومت کو کھلی خیانت سے مستہم کریں اور لوگوں کو بتادیں کہ یہ لوگ تو اینٹ الہیہ کی توہین کرتے ہیں، ان کا انتخاب خلاف سنت کُتاب اور دروازِ صحت و صواب ہے۔

فاطمہؑ کو مقابلہ کے لیے دو ایسی قوتیں حاصل ہو گئیں جو علیؑ کو حاصل نہ ہوئیں، اگر وہ بجائے فاطمہؑ قیام کرتے:

① — فاطمہؑ اپنے مصائب اور اپنے باپ کی نظر میں اہمیت کے باعث زیادہ قادر تھیں اس بات پر کہ مسلمانوں کے احساس کو بیدار کر سکیں اور ان کے جذبات کو ابھار سکیں اور مسلمانوں کو اپنے باپ سے ایک روحانی رشتے کے ذریعے متصل کر دیں۔

② — فاطمہؑ کو معلوم تھا کہ میری مفاہمت کسی حد تک پہنچ جائے لیکن اس میں کوئی مسلح جنگ نہیں قائم ہو سکتی۔ جب تک کہ میدان میں فاطمہؑ اور گھر میں علیؑ ہیں اب فاطمہؑ پر فتنہ کا الزام نہیں آسکتا۔

اس وقت امامؑ نے چاہا کہ اپنی آواز فاطمہؑ کی زبان سے سنائیں اور خود میدانِ معرکہ سے دور رہ کر اس وقت کا انتظار کریں جب کہ قیام کر کے کچھ فائدہ حاصل کر سکیں۔ امامؑ نے یہ بھی چاہا کہ امت کے سامنے قرآن سے ثابت کر دیں کہ فاطمہؑ کا مقابلہ خود بھی بطلانِ خلافت کی واضح دلیل ہے۔

امامؑ نے جو چاہا انھیں حاصل ہو گیا۔ جب فاطمہؑ نے ان کی شخصیت کی وہ صحیح ترجمانی کی جس کے وہ اہل تھے۔

فاطمی مقابلہ کے مناظر

فاطمی اقدام کا خلاصہ ان مناظر میں مضمون ہے :

① — فاطمہؑ نے ایک شخص کو بھیجا کہ ابو بکر سے مسائل میراث میں بحث کرے اور ان کے حقوق کا مطالبہ کرے۔ یہ فاطمہؑ کا پہلا تہمیدی قدم تھا جس کے بعد وہ میدان میں آنے والی تھیں۔

② — فاطمہؑ خود ابو بکر کے سامنے آئیں اور چاہا کہ اپنی طلب میں شدت سے کام لیں تاکہ خلیفہ کی قوتِ مخالفت کا صحیح اندازہ ہو سکے۔

بعض حضرات نے خیال ظاہر کیا ہے کہ مطالبہ کی ترتیب میں پہلے دعویٰ عطیہ تھا، اس کے بعد دعویٰ میراث، لیکن میرا خیال یہ ہے کہ اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ بہت ممکن ہے کہ پہلے دعویٰ میراث ہی رہا ہو، اس لیے کہ روایت میں تصریح ہے کہ نماذہ فاطمہؑ نے صرف میراث کا مطالبہ کیا تھا اور اس کی نمائندگی کی شان بتاتی ہے کہ یہ پہلا قدم تھا، جبکہ نظر ثانیاً مقابلہ تدریجی ہوتا ہے، علاوہ اس کے کہ دعویٰ وراثت کا اثبات بھی زیادہ آسان تھا۔ اس لیے کہ توارث شرع اسلامی کا واضح ترین قانون ہے۔ لہذا دعویٰ ارث سے ابتدا کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے اس لیے کہ اسی میں فدک داخل ہے جیسا کہ خلیفہ کے انکار عطیہ سے اندازہ ہوتا ہے۔ مگر یاد رہے کہ مطالبہ میراث میں اور دعویٰ عطیہ فدک میں کوئی تضاد نہیں ہے اس لیے کہ مطالبہ میراث عام ترکہ نبیؐ سے متعلق

ذمہ تھا، نہ کہ خاص فذک سے اور مطالبہ عطیہ فذک ہی سے متعلق تھا۔

۳ — وفات پیغمبر اسلام کے دس دن کے بعد فاطمہ نے مسجد میں

خطبہ دیا۔ (شرح شیخ ابلاغتہ معتزلی)

۴ — فاطمہ کی ابو بکر و عمر سے گفتگو، جب وہ عذر کرنے کے لیے آئے۔

اور آپ نے کہہ دیا کہ میں غضب تک ہوں اور اس سے خدا و رسولؐ
بھی ناخوش ہیں۔ (الاماتہ و السیاستہ ص ۱۴)

۵ — فاطمہ کا وہ خطبہ جو انھوں نے زبان مہاجرین و انصار کے

درمیان ارشاد کیا تھا۔

۶ — فاطمہ کی وصیت کہ میرے دشمن میرے جنازہ میں شریک نہ ہوں

(حلیۃ الاولیاء ج ۲ ص ۴۳ مستدرک حاکم ج ۳ ص ۱۶۳،
اسد الغابہ ج ۵ ص ۵۲۴)

(یہ اعلان آج سے بھی فاطمہ زہرا کی خلافت حاضرہ سے مخالفت کا)

فاطمہ کی ناکامی اور کامیابی

فاطمی اقدام ایک اعتبار سے ناکام رہا اور ایک اعتبار سے کامیاب۔

ناکام اس لیے رہا کہ فاطمہ اپنے آخری جہاد میں جبر کہ وفات پیغمبرؐ

کے دسویں روز بذریعہ خطاب کیا تھا حکومت وقت کو تباہ و برباد نہ کر سکیں۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ فاطمہ اس میدان میں ناکام کیوں ہوئیں البتہ

اتنا ضرور معلوم ہے کہ اس ناکامی میں خلیفہ کی شخصیت کا بڑا ہاتھ ہے۔ اس لیے کہ وہ سیاسی

عطایا میں بڑے استاد تھے۔ انھوں نے فاطمہ کا مقابلہ اس ہنرمندی سے کیا کہ جس کا مظاہرہ

فاطمہ کے کلام کے جواب اور انصار کے جمع کے خطبہ سے ہوا۔ ایک طرف تو فاطمہ کے جواب

ہیں آنسو بہ رہے تھے اور دوسری طرف دل میں آگ بھڑک رہی تھی کہ فاطمہؑ سانسے سے ہٹ جائیں تو انصار کو مطمئن کیا جائے۔ جیسا کہ ہوا۔ فاطمہؑ کے مسعد سے نکلتے ہی خطبہ شروع ہو گیا:

”تم لوگ ہر ایک کی بات سن لیتے ہو، یہ علیؑ کی ترویج

کرتا چاہتی ہیں جو کہ فتنوں کا مرکز ہیں۔۔۔ الخ“

وقت و گریہ سے غضب و غیظ کی طرف فوری انتقال یہ بتانا ہے کہ خلیفہ کو حالات بدلنے کی چالوں پر پورا عبور حاصل تھا۔ اور وہ وقتی طور سے بہترین تمثیل بنا سکتے تھے۔

فاطمہؑ کا میاب اس طرح ہوئیں کہ انھوں نے حق کو ایک لازوال طاقت دے دی اور باطل کو نیست و نابود کر دیا۔ فاطمہؑ کی کامیابی کا اظہار اس وقت ہوا جب دونوں معذرت کے لیے آئے اور فاطمہؑ نے کہا کہ:

”ایک حدیث کی گواہی دو۔ میرے باپؑ نے فرمایا ہے

کہ فاطمہؑ کی رضا میری رضا اور فاطمہؑ کا غضب میرا غضب ہے

اس کا دوست وہ میرا دوست، جو اس کا دشمن وہ میرا دشمن“

اور دونوں نے گھبرا کر تصدیق کر دی تو فاطمہؑ نے اعلان کر دیا، خدا و ملائکہ شاہد ہیں کہ تم لوگوں نے مجھے ناراض کیا، میں بابا سے تمھاری شکایت کروں گی۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ فاطمہؑ نے اپنے اعتراض کو مستحکم کرنے کے

۱۔ صحیح بخاری ج ۵ ص ۲۵۶، صحیح مسلم ج ۴ ص ۲۶۱، مستدرک حاکم ج ۳ ص ۱۵۳، ذخائر العقبیٰ ص ۳۱

صواعق محرقة ص ۱۵۱، اسناد احمد ج ۴ ص ۳۲۵، ترمذی ج ۲ ص ۲۱۹، ابن ماجہ ج ۱ ص ۲۱۲

۲۔ صحیح بخاری ج ۵ ص ۲۵۶، ۱۹ ص ۱۹۹، مسلم ج ۲ ص ۲۶۱، اسناد احمد ج ۱ ص ۱۵۱، تاریخ طبری

ج ۴ ص ۲۰۲، کفایات الطالب ص ۲۲۶، سنن بیہقی ج ۶ ص ۳۳

یے کس قدر اہتمام کیا تھا تاکہ اس نزاع سے ایک دائمی نتیجہ حاصل کریں۔ تاکہ افکارِ فاطمی کی وضاحت ہو جائے اور ان کے نظریات معلوم ہو سکیں۔

فاطمہؑ کا اعتقاد یہ تھا کہ میرا حاصل کردہ نتیجہ دین و عقیدہ کے حساب میں بڑا قیمتی ہے اور وہ یہ کہ صدیقِ مستحق غضبِ الہی و غضبِ رسولؐ ہیں انھوں نے خدا و رسولؐ کو اذیت دی اور ان کو ناخوش کیا ہے اور ظاہر ہے کہ ایسا انسان مستحقِ خلافت و امامت ہو سکتا ہے۔

تسّرآن کہتا ہے:

”مسلمانوں! تمہیں خدا و رسولؐ کو اذیت دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ جو لوگ خدا و رسولؐ کو اذیت دیتے ہیں وہ دنیا و آخرت میں مستحقِ لعنت ہیں، جو رسولؐ کو اذیت دے وہ مستحقِ عذابِ الیم ہے۔“

”اے اہل ایمان! ان کو ولی نہ بناؤ جن پر اللہ کا غضب ہے، جن پر اللہ کا غضب ہے وہ گمراہ ہیں۔“



اقتباساتِ کلامِ فاطمیؑ

عظمتِ پیغمبرؐ روحانی منازل میں

ہم اس مقام پر خطبہ جناب فاطمہ زہراؑ کے چند اقتباسات نقل کر رہے ہیں تاکہ ان کی باقاعدہ تحلیل و توضیح کی جائے اور یہ سمجھا جائے کہ اس کلام سے شہزادی عالم کا حقیقی مقصد کیا تھا؟

آپؑ فرماتی ہیں:

«اللہ نے پیغمبرؐ کو کمالِ شفقت و رعیت و ایثار

کے ساتھ اپنے پاس بلا لیا۔ اب پیغمبرؐ کو تعب و قیاسے راحت

مل گئی، ان کے گرد ملائکہ برابر، ان کے سر پر رحمتِ غفار اور

ان کے جوار میں ملک جبار ہے۔»

ذرا دیکھو تو! اس مخدرہ نے کیوں کر تمام مادی نعمتوں کا ذکر

چھوڑ کر، فردوس باقی اور رحمتِ غلہ کا تذکرہ شروع کر دیا۔ مخدرہ یہ سمجھتی ہے کہ میرے

باپ کی منزل، ان نعمتوں سے اجل وارفع ہے۔ لذتِ مادی خواہ وہ کیسی ہی عظیم ہو اس

محمدؐ کی نظر میں جو روحانیت کا علمبردار تھا، جس کی منزل کمال تک کوئی دوسرا انسان نہیں پہنچ سکتا، بالکل سچ ہے۔

فاطمہؑ کی تربیت اس مصلح اعظم کے ہاتھوں سے ہوئی جو عقیدہ الہیہ کا حامل تھا۔ وہ عقیدہ الہیہ جو فکری پرواز کی آخری منزل اور طواف انسانیت کا آخری دور ہے۔ جہاں پہنچ کر ضمیر کو سکون اور روح کو دولت ایمان حاصل ہو جاتی ہے۔

رسول اکرمؐ! وہ روح کامرئی اور روحانیت کا قائد اعظم، جس کے جذبے کے سایہ میں روح نے مادی قوتوں کو نیست و نابود کر دیا۔ جب محمدؐ اس میدان کا مجاہد اگبر ہے جہاں مادہ و روح کی فیصلہ کن جنگ ہوتی ہے تو پھر کیا تعجب ہے کہ محمدؐ عربی کو عالم روحانیت محور بنا کر دیا جائے اور افلاکِ روح کی گردش ان کے اشاروں پر مانی جائے جیسا کہ فاطمہؑ نے اظہار کیا کہ محمدؐ عربی کے گرد ملائکہ رحمت جمع ہیں گویا کہ یہ ذات دنیا و آخرت میں قطب کی حیثیت رکھتی ہے۔

فرق یہ ہے کہ دنیا میں پریشانی ہے اس لیے ابھی حیات انسانیت کی گردشوں کی اصلاح کر رہا ہے اور آخرت میں مطمئن ہے اس لیے ملائکہ استفادہ نور اس مرکز انوار سے کرتے ہیں اور اس کے گرد جمع رہتے ہیں۔

جب پیغمبرؐ اس منزل کا انسان ہے تو اس کی جنت بھی ویسی ہی ہوگی وہاں مادی نعمتوں کا کیا ذکر ہو سکتا ہے، وہاں تو روحانی لذتیں اور پاکیزہ الطاف ہیں۔ اس سے بلند نعمت کیا ہو سکتی ہے کہ انسان ملک جبار کے سمہایہ میں رہے اور اس کے سر پر سایہ رضوان الہی چھایا رہے۔

اس طرح فاطمہؑ اپنے باپ کی جنت کو دو لفظوں میں بیان کر دیتی ہیں یہ وہ قطب ہے جو مدار انوار سے متصل ہے اور یہ وہ آفتاب ہے جس کا ملائکہ نور احاطہ

لے یہ نعتہ میں نے اپنی کتاب "العقیدۃ الہیہ فی الاسلام" سے نقل کیا ہے۔

کیے ہوئے ہیں۔

پھر فرماتی ہیں:

”تم جہنم کے دروازے پر تھے، ہر بیباک کی نظر تم پر پڑتی اور ہر طماع کا لقمہ تم تھے، لوگ تمہیں اپنے پیروں سے کھلتے تھے تم گندہ پانی پیتے اور پتے چباتے تھے، تمہاری زندگی ذلت و خواری کی تھی۔ ہر وقت خطرہ لگا رہتا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ لوگ تمہیں گھبر کر ہلاک کر دیں۔ اللہ نے تمہیں ان مصائب سے محفوظ رکھا کے ذریعہ نجات دی۔ ان باتوں کے علاوہ جب پیغمبرؐ، بانو حبیبہؓ انسان اور پھیرے جیسے عزوبوں میں مبتلا ہو گیا جن میں سرکش قسم کے اہل کتاب بھی تھے جن کی آتش فساد کو اللہ نے کبھی بھڑکے نہیں دیا جب کبھی شیطان نے سرا بھارا یا مشرکین نے کوئی بے ادبی کی تو پیغمبرؐ نے اپنے بھائی کو سینہ سپر کر دیا جس کی شان یہ تھی کہ جب تک فتنوں کے کان نہ بند کر دے اور جب تک آتش فساد کو اپنی تلوار کے پانی سے خاموش نہ کرے میدان سے پلٹنا نہ تھا۔ وہ ذات خدا میں کوشاں، امراہی میں جدوجہد کرنے والا، رسول اللہؐ سے قریب، اویار خدا کا سردار، امت کا ناصح، عمل کے لیے مکرست، اسلام کے لیے سعی اور ترویج دین کے لیے جفاکش تھا۔ ان تمام شدائد میں تم فارغ البال اور مطمئن تھے۔ تم کو کوئی گزند نہیں پہنچا۔“ اے

اے اس کلام سے فاطمہ زہراؓ کی مراد اس وقت کی حاکم جماعت ہے جیسا کہ ہم آئندہ

دراخ کریں گے۔ (مترجم)

فاطمی موازنہ امام و اغیار کے درمیان

کیا عجیب مقابلہ ہے اس شخصیت کے درمیان جس کو فاطمہ زہرا نے دنیائے اسلام کی قوتِ عسکرینے کا حاصل قرار دیا ہے اور اس کے درمیان کہ جو مکہ شجاعت اور عسکری قوت سے کلی طور پر عاری تھا۔۔۔ اس مقدس ذات کے درمیان جس کی شجاعت کے نعرے آسمانوں میں لگائے گئے، جس کے کارنامے فہرستِ مثالیات میں دوامی حروف سے لکھے گئے اور اس شخصیت کے درمیان جو میدانِ جہاد سے الگ رہ کر ہمیشہ عریضہ میں پناہ گزین رہے اور کاش اتنا ہی ہوتا اور وہ فرار اختیار نہ کیا جاتا جو قربانی اور آدابِ فداکاری کے میدانوں میں حرام و ناجائز قرار دیا گیا ہے۔

ہم نے تاریخِ انسانیت میں اس نجمِ صحابیت کا کوئی کارنامہ ایسا نہیں دیکھا جو قابلِ ذکر ہو، برطانت میدانِ جہاد میں علوی کارناموں کے، اس لیے کہ امام کے موافق میدانِ جہاد و قتال میں ایسے ہیں جنہیں دنیائے اسلام اپنا مرکز اور تاریخِ مذہب نے اپنی سرخی تسلیم کر دیا ہے۔

علیؑ تاریخِ نبوت کے لحاظ سے اول کا مسلم اول ہے۔ اس وقت جب صورتِ رسالت دہنِ پیغمبر سے نکلی اس کے بعد علیؑ ہی وہ غیور اور مجاہد ہے جس کے حوالہ کفار سے تصفیہ حساب آسمان کی طرف سے کیا گیا۔

۱۔ تاریخ کا یہ فقرہ نہایت ہی معروف ہے "استوی الاسلام بسیف علیؑ" اسلام علیؑ کی تلوار سے غالب ہوا ہے۔

۲۔ لافسٹی الاصلیٰ کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر چکا ہے۔ (مترجم)

۳۔ جن مورخین نے تلفظِ وقت کے فرق سے دامنِ بیانا چھپا انہوں نے اتنا ضرور اعتراف کیا ہے کہ یہ لوگ رسولِ اکرمؐ کے ساتھ ایک محفوظ جگہ پر پناہ گزین رہتے تھے۔

استحقاقِ خلافت کے بارے میں امام کی کاسیابی و وجہتوں سے ہے۔

① — یہی وہ بے مثل سپاہی ہے جس نے جملہ مسلمانوں کے آگے میدانِ جہاد میں اس وقت قدم جمائے جب میدانِ جہاد کو سیاسی مرکزیت سے الگ نہیں کیا گیا تھا۔

② — امام کلبے مثل جہاد اس اخلاص کی کامل دلیل ہے جس میں کسی شک کی گنجائش نہیں اور حرارتِ ایمانی کا یہی وہ بھرکتا ہوا شعلہ ہے جو تاقیامت خاموش نہیں ہو سکتا۔ اخلاصِ کامل اور حرارتِ ایمانی یہ دو بنیادی شرطیں ہیں اس شخصیت کے لیے جو مستبد حکومت پر بیٹھ کر امتِ اسلامی کی حفاظت کا ذمہ داری بنے۔

آپ حیاتِ رسولؐ اور جہادِ رسولؐ کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ علیؑ ہی کی وہ ذات ہے جس نے اپنی مواسات سے زمین و آسمان کو مددپوش کر دیا۔ اور صدیقِ ہی کی وہ

تاریخ طبری میں ابنِ رافع سے منقول ہے کہ جب علیؑ ابنِ ابی طالبؑ علمبرداروں کو تیغ کر چکے تو رسولِ اکرمؐ نے ایک جماعتِ مشرکین پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔ علیؑ نے انھیں بھی قتل کر دیا پیغمبرِ اکرمؐ نے دوسری جماعت پر حملہ کا حکم دیا۔ علیؑ نے اسے بھی قتل کر دیا تو جبرئیل نے آکر عرض کی: یا رسول اللہؐ! یہ مواسات ہے۔ آپ نے فرمایا: کیوں نہ ہو وہ مجھ سے ہے اور میں اس سے ہوں۔ جبرئیل بول اٹھے اور میں آپ دونوں سے۔ لافتنی الامسلی لاسیف الا ذوالفقتار۔ آپ ذرا غور کریں کہ پیغمبرؐ نے مواسات سے وحدت کی عکاسی کس طرح توجہ فرمائی۔ اس لیے کہ مواساتِ تعدد اور دوئی پر دلالت کرتی ہے۔ پیغمبرؐ نے چاہا کہ مجھ میں اور علیؑ میں تعدد اور دوئی رہے اس لیے اپنا جہز بنا لیا تاکہ دنیا کے مواساتِ تاقیامت علیؑ کے کردار کو شیعہ راہ اور شمالِ انصاریت اور مواعظِ ارتقاہ قرار دیتی رہے۔ اب اس کے بعد بتائیں کہ کیا انصاف یہی ہے کہ جسے پیغمبرؐ اپنا جہز قرار دیا اس کے اور پیغمبرؐ کے درمیان تین اجنبی اشخاص کا نام ملے قرار دے دیا جائے۔

ذات ہے جس نے اس مرکز قیادت میں پناہ لی جو مستند سپہ سالاروں کے حلقہ میں گھرا ہوا تھا۔
اور یہی وہ شخصیت ہے جس نے روزِ احد، فاروق کے ساتھ فرار اختیار کیا اور دستِ پیغمبر
پر موت کے لیے بیعت نہیں کی۔

تاریخ مسلمانین بتاتی ہے کہ شہادت کے لیے دستِ رسول پر آٹھ
آدمی، ۳ ہاجر اور ۵ انصار نے بیعت کی تھی لیکن ان میں کہیں اس بلند شخص کا پتہ نہیں ملتا۔
سوال یہ ہے کہ اگر حضور نے فرار اختیار نہیں فرمایا تو بیٹھے کیوں رہے؟ جب کہ
جہاد اس وقت تک واجب رہتا ہے کہ جب تک دشمن کے مقابلہ کی پوری قوت جمع نہ ہو
جائے۔ اور ظاہر ہے کہ ایسا نہیں تھا۔ ورنہ پیغمبرؐ اس قدر زخمی نہ ہوتے کہ بیٹھ کر نماز ادا
کریں۔ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ وسط میدان اور عرصہ جنگ میں آنے والا موت سے
سخت حاصل نہیں کر سکتا جب تک کہ دوہیں سے ایک راہ اختیار نہ کرے۔
یا شہید کرے یا سب کے ساتھ دفاع کرے۔

اگر صدیق نے ان میں سے کوئی کام نہیں کیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک
دشمن دوسرے کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا رہا اور اسے کسی نے قتل نہ کیا۔ کیا یہ کہا جائے
کہ مشرکین رسولؐ و علیؑ وغیرہ سے نہ ڈرے اور صدیق سے ڈر گئے؟
میری سمجھ میں یہ فلسفہ نہیں آتا۔ سوائے اس کے کہ یہ کہا جائے
کہ صدیق نے جو ہر رسولؐ میں کھڑے ہو کر ایسی جگہ حاصل کرنی کہ جو خطرہ کے مقامات سے

۱۔ عیون الاثر ج ۱ ص ۲۵۸

۲۔ تاریخ الخلفاء

۳۔ شرح بیع ابلاغ ج ۳ ص ۳۸۹-۳۹۰

۴۔ شرح بیع ابلاغ ج ۳ ص ۳۸۸

۵۔ شرح بیع ابلاغ ج ۳ ص ۳۸۹

بقدر حاجت و در تھی اس لیے کہ مجاہدین کی ایک جماعت اس کی حفاظت میں مشغول تھی۔
 یہ بات کچھ بعید نہیں ہے۔ اس لیے کہ ہم نے مذاقِ صدیق سے یہ
 سمجھ لیا ہے کہ وہ میدانِ جنگ میں رسولؐ کے پہلو میں رہنا زیادہ پسند کرتے تھے، اس لیے
 کہ یہی وہ جگہ ہے جہاں جنگ کی تکالیف سے محفوظ رہنے کے اسباب جہاں رہتے تھے۔
 آپ حیاتِ امامؐ اور حیاتِ صدیق کا مطالعہ کر کے یہیں بتائیں کہ کیا حیاتِ
 امامؐ میں کسی مقام پر اخلاص کی خاموشی، جذبہِ قربانی کی کمی اور میدانِ جنگ میں راحتِ اللہینا
 کی تلاش نظر آتی ہے؟ خوب دیکھ لیجیے، باقاعدہ نظر کر لیجیے!

انشاء اللہ ہر کا نام ایک دوسرے سے بہتر اور بہتر ربانی
 دوسری سے مانوق پائیں گے۔۔۔۔۔! یہ وہ شخصیت ہے جہاں باطل کا گزرنہیں،
 اس میں دوام و فکر کی اتنی ہی استعداد پائی جاتی ہے جتنی اس کے استاد محمدؐ عربی میں۔
 اس لیے کہ یہ اس کا نفس ہے ایسے

اب زماذ رسولؐ میں صدیق کی زندگی ملاحظہ کریں۔ کیا اس میں سوائے
 صفتِ عقیدہ اور ترکِ جہاد کے کچھ اور نظر آتا ہے؟
 کبھی عریش میں پناہ گزین اور کبھی پہاڑ پر اچکے نظر آئیں گے
 کبھی ہمارے لشکر سے جدا ہو کر پیغمبرؐ کے مقرر کردہ امیر کی مخالفت کرتے دکھائی دیں گے

۱۔ اس کی واضح دلیل آیتِ مبارکہ ہے۔

سۃ علیہ ۲۵ ۲۳ جس میں ثابت قدم رہنے والوں میں آپ کا اسم شریعت نہیں ہے۔
 رہ گیا سرارِ عمر، تو اس پر صحیح بھناری کی روایت دال ہے جس کا راوی جنگِ حنین کا ایک
 فرزند ہے۔ وہ کہتا ہے کہ عالم سرار میں میں نے عمر کو دیکھا۔ پوچھا مسلمانوں کا کیا مشورہ ا
 فرمایا: اللہ مالک ہے۔ یہ واضح دلیل ہے کہ آپ فراریوں میں تھے۔

کبھی خیبر میں سجائے فتح قلعہ قوص، ہزیمت خوردہ نظر آئیں گے جس کی داؤد شجاعت ان کے وزیر اعظم حضرت فاروق دین گئے اور مسلمانوں کو بزدلی پر آمادہ کرینگے۔ یہاں تک کہ پیغمبرؐ کو کبنا پڑے گا :

”کل میں علم دوں گا..... الخ“

اور اس کلام سے ایک ایسی تعریف ظاہر ہوگی جس سے ہزیمت خوردہ مشغول کے جو اس اڑ جائیں گے اور علیؑ کی وہ شخصیت نمایاں ہوگی جو محبوب خدا و رسولؐ اور محبوب خدا و رسولؐ ہے۔ (ملاحظہ ہو صحیح بخاری ج ۵ ص ۵۳۵ ح ۵۳۵۳)

اے مسلمانوں کے دونوں خلیفہ!

کیا تمہارا پیغمبرؐ جس کی تیابت کے تم مدعی ہو وہ بھی ایسا ہی تھا؟
 کیا تم نے پیغمبرؐ سے جہاد اور راہ خدا میں قربانی کے درس نہیں حاصل کیے؟
 کیا اتنی مدت تک صحبت پیغمبرؐ میں رہنے کے بعد بھی تم میں کوئی خدبہ ایسا نہ پیدا ہوا جو تمہیں شرار سے روکتا؟
 کیا تم نے فتنہ آن نہیں سنا جس نے تمہارا فریضہ حفاظت پیغمبرؐ اور شر احکام اسلامی قرار دیتے ہوئے کہا ہے :

۱۔ سند احمد ج ۵ ص ۲۵۳، مستدرک حاکم ج ۳ ص ۳۴، کنز العمال ج ۶ ص ۳۹۳

۲۔ یہ بے مکمل تصویر شجاعت حضرت فاروق اعظم کی جن سے اسلام کی عزت وابستہ تھی۔

۳۔ میرا خیال ہے کہ وہ لشکر جو علیؑ کے ساتھ گیا تھا یہ وہی سابق ہزیمت خوردہ لشکر تھا اور

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قائد لشکر کی شخصیت کا لشکر پر کتنا اثر پڑتا ہے۔ وہ فوج

جس کی کمزوری کا کل فاروق نے اعلان کیا تھا آج اسی میں وہ پہلوان نکل رہے ہیں

جن کے قدم میدان سے اگھرتے ہی نہیں۔ ہرٹ اس لیے کہ قائم کے ثبات قدم نے ان کے

اجسام میں روح استقلال و استقامت پھونک دی ہے۔

”جو میدان سے بلا ضرورت بھاگ جائے اس پر غضب
خدا ہے اور وہ شخص جہنمی ہے۔“

شاید آپ یہ کہیں کہ صدیق و فاروق کا مقام اس سے بلند ہے
کہ وہ مندر اختیار کریں۔ شاید انھوں نے کوئی عذر پیداکر لیا ہو، اس لیے کہ ان کے اختیار
میں تاویل کی گنجائش بہت زیادہ تھی جیسا کہ خالد ابن ولید کے واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ
اس نے مسلمانوں کو عمدہ قتل کیا۔ اور صدیق نے کہہ دیا، یہ ایک اجتہادی غلطی ہے۔
ہم اس عذر کو قبول کیے لیتے ہیں اگر ہمارے سابقہ بیان کردہ
واقعات قبول عذر کی اجازت دیں۔ (ملاحظہ ہو تاریخ ابن شحنہ بر حاشیہ کامل ج ۱ ص ۱۱۱)

اعلانِ فاطمی سیاہ وقت کے متعلق

جناب فاطمہ زہراؑ فرماتی ہیں :
”تم ہمارے شدائد کے منتظر اور ہمارے اخبار
کے متلاشی تھے۔“

اس خطاب کا رخ حاکم وقت جماعت کی طرف ہے۔ اس
لیے کہ اسی نے وہ خیال قائم کیا تھا جس پر فاطمہ زہراؑ نے تنقید کی ہے اور وہ ہے بیعت
میں جلد بازی کا عذر خوفِ وقت۔

یہ خطاب اس جماعت کے لیے ایک صریح اتہام ہے کہ یہ
لوگ حکومت کے خواہاں اور جو یا تھے۔ اور اسی کے لیے برابر تدبیریں کیا کرتے تھے اور
ایسے راستے معین کر رہے تھے جو مطلب تک پہنچا دیں اور ایک ایسے وقت کے منتظر تھے
کہ جس میں تختِ خلافت پر قابض ہو کر بیتِ ہاشمی کو اس کے منصبِ قدیمی سے ہمیشہ
کے لیے محروم کر دیں۔

ہم پہلے ثابت کر چکے ہیں کہ صدیق، فاروق اور ابو عبیدہ میں خفیہ سازش تاریخی شواہد کی بنا پر مسلمات میں سے ہے۔ ہم اپنے مقصد پر کلام معصومہ سے بہتر کوئی دلیل نہیں چاہتے، اس لیے کہ وہ اس دور کی معاصر ہیں۔ وہ حوادثِ وقت کو ان نقاد اور مبصرین سے بہتر سمجھ سکتی ہیں جو کہ ہزار ہا سال کے بعد دنیا میں تاریخی افسانوں پر اپنی تحقیقات کی بنیاد قائم کریں گے۔

حق یہ ہے کہ اگر علیؑ کو الگ کر دیا جائے تو بظاہر اس حزبِ حاکم کا انکشاف سب سے پہلے فاطمہؑ نے کیا ہے اور انھیں نے اس کو خواہشِ سلطنت سے متہم قرار دیا ہے۔ اس کے بعد ان کے معاصرین امیر المؤمنین و معاویہ بن ابوسفیان وغیرہ میں جرأتِ اظہار پیدا ہوئی۔

جب تک یہ جماعت جس کے وجود کا فاطمہؑ کو یقین ہے اور جس کی طرف امام اور معاویہ نے اشارہ کیا ہے تحتِ حکومت اور مورست پر قابض رہے گی اور جب تک بعد میں آنے والی نسلیں اسی اصولِ سیاست کو اپنی حکومت میں صرف کریں گی اور اسی متہم پارٹی کو اپنائی رہیں گی جس نے دنیائے اسلام کو تباہ و برباد کر دیا ہے، اس وقت تک ہم تاریخ میں اس جماعت کی صحیح تشکیل کا پتہ نہیں لگا سکتے جس کی پشت پر کام کرنے والے بڑے بڑے مفکر لوگ تھے جن کا مشغلہ یہ تھا کہ وہ حکومت کے کردار کو شہر علیؑ میں رنگ دیا کریں۔

مگر ابوجبیدہ صحت فرماتیں کہ میں نے انھیں کسی لقب سے یاد نہیں کیا اور یہ میری خطا نہیں ہے بلکہ اس اجل کی ہے کہ جس نے ان تک خلافت نہ پہنچنے دی۔ ورنہ انھیں بھی لوگ کسی زکریا لقب سے سرفراز ہنرہ کرتے۔ رہ گیا ان کا معروف لقب امین، تو یہ انھیں زہی پیغمبر کی جانب سے ملا اور نہ ہی عامتہ اناس کی جانب سے بلکہ یہ لقب انھیں خردان کی اپنی پارٹی نے دیا تھا۔

تصریح صدیقیہ خلافت ابوبکر اور فتنہ کبریٰ کے متعلق

آپ فرماتی ہیں :
 ” تم نے غیر کے اونٹ کو نشان لگا دیا اور دوسرے
 کے چشمہ پر وارد ہو گئے۔ حالانکہ ابھی زمانہ قریب کا ہے اور زخم
 کشادہ ہے، جراحت کا اندمال نہیں ہوا، رسولِ مہذب نہیں
 ہوئے۔ جلدی صرف خوب فتنہ کے نام پر کی گئی حالانکہ تم فتنہ
 میں واقع ہو گئے اور جہنم تو کفار پر بہر حال محیط ہے۔“
 ” یہ سب تدبیریں دودھ کے لیے کی گئیں جو آخر کار
 خون بن گیا۔ اور یہی عین خسارہ ہے۔ اب تابین کو ان کے
 پیشواؤں کے کتوت کا علم ہو گا، اب خوب خوش ہو، عنقریب
 تم پر چمکی تموار، منڈی مشکلات، بے پناہ استبداد کا غلبہ ہو گا
 جو تم کو تباہ و برباد کر دے گا۔ افسوس صد افسوس تمھارے
 حال پر۔“

اگر صدیق اور ان کے ساتھی ایک خاص قسم کا گروہ بنا بھی رہے
 تھے تو ہمیں ان سے اس امر کی امید نہیں تھی کہ وہ اس کے خطوط نمایاں کریں گے یا اس کے
 نتائج کا کوئی اعلان کریں گے۔ لیکن اس کے باوجود ہمیں ان نتائج کے سمجھنے کی ضرورت ہے۔
 اتنا ضرور دیکھا گیا ہے کہ روزِ سقیفہ ان لوگوں نے بیعت میں بڑی جلد بازی سے کام لیا، اور
 اسے اس بیان میں اشارہ اس امر کی طرف ہے کہ تم نے اس خلافت پر قبضہ کر لیا جس کے تم حقدار نہیں تھے۔
 اور ظاہر ہے کہ دوسرے کے حق کو غصب کر لینے سے بڑا فتنہ کیا ہو سکتا ہے؟ (مترجم)

سلطنت کے لیے اسی طمع و حرص کا مظاہرہ کیا جس کی توقع اس وقت کے صحابہ کرام سے نہ تھی۔ اس لیے کہ اس دور کے انسان دیندار و عاقل تھے جن کی فکر صرف رائج اسلام اور حفظِ شخصیتِ اسلامی سے متعلق تھی۔ ملکیتِ شخصی اور اقتدار پرستی جیسی باتیں تلافیہ محمد کو ملی سے بہت بعید ہیں۔

حکام نے بھی اس امر کا احساس کیا کہ ان کی اپنی حرکتیں اصولِ اسلام سے بعید اور شانِ صحابیت سے بالکل بیگانہ ہیں۔ لہذا ان لوگوں نے چاہا کہ اپنے کردار میں بلند مقاصد کا پیوند لگائیں اور فتنہ کے نام سے ان کی عیب پوشی کریں، لیکن انھیں یہ خیال نہ رہا کہ پیوند سے لباس رسوا ہو جاتا ہے اور بے ربط رفو کپڑے کو بد نما بنا دیتا ہے۔ اسی لیے فاطمہ زہرا نے اپنے دائمی کلمات سے اعلان کر دیا:

”یہ لوگ جس فتنے سے بچنے کے نام پر سب کر رہے ہیں اسی میں بالآخر گر پڑے، اور جنم ان کا حقیقی مرکز ہے حقیقتاً یہ فتنہ ہے بلکہ امّ الفتن ہے۔“
کیا کبنا تیری بلافت کا اے بضعتہ النبی!

تو نے ایک تلخ حقیقت کو بے نقاب کر دیا اور اپنے باپ کی امت کے سامنے اس وحشت ناک مستقبل کو پیش کر دیا جس میں سرخ بادل چھائے ہوئے نظر آتے ہیں۔

ہیں کیا کہوں _____؟

اب تو خون کی ندیاں بہیں گی جس میں انسان ڈوبتے نظر آئیں گے اور فاطمہؑ سلفِ صالح سے اب مصائب کی فریاد یوں ہی کریں گی کہ:
”یہ لوگ فتنہ میں مبتلا ہو گئے اور ان کا انجام جہنم ہے۔“
اے شہزادی! یقیناً یہ فتنہ ہے بلکہ لاریب، امّ الفتن ہے۔

اس سیاست کو کم از کم فاطمہؑ کی نظر میں توفیق ہی ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ
یہ اس بارون محمدی کے خلافت چلی گئی ہے کہ جس کی ذات گرامی میں حکومت اسلامی کے
جلد قوانین جلوہ گر نظر آتے ہیں۔
عجیب مذاق ہے کہ:

عمر اپنے کڑوت کا عذر خوب فتنہ کو قرار دیتا ہے اور اسے
یہ خبر نہیں کہ خلافت منشاء خدا و رسولؐ حقدار سے خلافت چھین کر غیر مستحق کو دے
دینا، یہ بھی ایک فتنہ ہے، بلکہ اس لفظ میں جتنا عظیم مفہوم پوشیدہ ہو سب کا
مستحق ہے۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ:

اگر ان لوگوں کو فتنہ کا خوف تھا اور یہ حکومت کے طالب
نہیں تھے، مگر اس مقدار میں کہ جو اسلام کے لیے مناسب ہو تو انہیں کس بات نے اس
امر سے روک دیا تھا کہ رسول اکرمؐ سے خلیفہ کے متعلق سوال کرنے، یا ان سے خواہش
کرتے کہ اپنے بعد کے لیے مرجع اعلیٰ مقرر کر دیں۔

حالانکہ پیغمبرؐ کا مرض الموت کافی دیر تک رہا اور آپ نے
بار بار اپنی موت کی خبر بھی دی۔ بلکہ لوگوں نے غسل و کفن کی ترتیب بھی پوچھی تھی۔

اے جنہیں حدیث غدیر کہ جسے ۱۱ صحابہؓ ۸۴ تابعین اور ۳۵۳ مولعین اہلسنت نے نقل کیا ہے۔ ملاحظہ
ہو۔ "الغدیر" علامہ امینیؒ یہ یاد رہے کہ قرآن کے اکثر اجزا کے لیے اتنی روایات نہیں ہیں جتنی حدیث غدیر
کے لیے ہیں۔ لیکن اس میں شک قرآن کے انکار کے مترادف ہے۔ البتہ یہی اس حدیث کی خلافت پر
دلائل تو اسے کتاب "مراجعات" علامہ عبدالحسین شریعت الدین میں ملاحظہ فرمائیں۔

۱۱۳-۱۱۵

۱۲۳

کیا یہ مسئلہ کسی کے ذہن میں آیا؟

کیا کسی کے دل میں یا حضرت عمر خائفِ فتنہ کے دل میں بھی یہ خیال پیدا ہوا کہ ان فتنوں کے دفع کرنے کا کوئی حل معلوم کر لیں۔ جن کو خود رسولِ اکرمؐ نے شبِ تاریک سے مشابہ قرار دیا ہے؟

حتیٰ کہ ادھر پیغمبرؐ کی روحِ اقدس نے قفسِ عنقریب سے پرواز کی اور مسلمانوں کے احساسات اور ان کی اسلامی غیرت میں سہجان پیدا ہو گیا اور ان کے دل خوفِ فتنہ سے بھر گئے۔

میرا تو عقیدہ ہے کہ!

ان میں سے کوئی بات نہ تھی۔ صرف بات یہ تھی کہ پیغمبرؐ سفینہٴ اسلام کا ناغدا پہلے ہی مقرر کر چکے تھے، اسی لیے امت نے سوال کا کوئی محل نہ دیکھا۔ ان باتوں کو چھوڑنے اور نہ پوچھنے کے لیے جو عذر چاہے تراشے لیکن اسے کیا کہا جائے کہ یہ اسلام کے غیور اصحاب، بجائے سوال کرنے کے، پیغمبرؐ اگر بیان بھی کرنا چاہتا ہے تو اسے روک دیتے ہیں حالانکہ جانتے ہیں کہ فتنہ بھی ایک گمراہی ہے جس کے دفع کے لیے پیغمبرؐ نے قلم و کاغذ طلب کیا ہے۔

کیا یہ کہا جائے کہ یہ لوگ صداقتِ رسولِ اکرمؐ میں شک کر رہے تھے؟ یا یہ کہا جائے کہ یہ لوگ تحفظِ اسلام اور خاتمہٴ فسادات پر نبیِ اسلام سے زیادہ قادر تھے؟

میرا دل چاہتا ہے کہ میں ناظرین سے یہ سوال کروں کہ رسولِ اکرمؐ کی مراد ان فتنوں سے کیا تھی جن کا تذکرہ آخر عمر میں آنحضرتؐ نے بقیع میں مردوں سے خطاب کر کے فرمایا تھا۔ آپؐ فرماتے ہیں:

۷ تم خوش قسمت تھے جو گزر گئے۔ اب وہ فتنے آگئے

ہیں جو مثل شبِ ہائے تاریک سیاہ ہیں

شاید آپ کہیں کہ اس سے مراد فتنۂ مرتدین ہے۔ میں اس بات کو قبول کر لیتا اگر مدفونین بقیع میں ارتداد کا احتمال ہوتا، حالانکہ یہ غیر ممکن بات ہے وہ صالحین اور مستقین کی منزل ہے وہاں مرتدین کا کیا گزر؟ اگر وہ مراد نہیں تو پھر ان کی خوش قسمتی کیا ہے کہ وہ نہ رہے۔

مکن ہے کہ کوئی خیال کرے کہ اس سے مراد وہ اموی چالیس ہیں جو عثمان و معاویہ نے اختیار کیں لیکن مشکل یہ ہے کہ یہ خلافِ منطوق ہے اس لیے کہ یہ بدعنوانیاں یقیناً ادوار کے بعد پیدا ہوئیں اور پیغمبرؐ یہ کہہ رہا ہے کہ فتنے آگئے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کو زمانہٴ رسولؐ سے منقطع ہونا چاہیے۔

اب کہنے دیجیے کہ مراد پیغمبرؐ ہی فتنے ہیں جو بعد رسولؐ بلا فاصلہ پیدا ہوئے جن کو بقیع میں دفن ہونے والوں سے خاص ربط ہے اور یہی وہ فتنہ ہے جس کے متعلق فاطمہ زہراءؑ نے فرمایا ہے کہ لوگ فتنے میں پڑ گئے۔ جب کسی ٹٹے کو رسول اکرمؐ فتنہ کہیں تو اب ہمارے لیے کیا ممانع ہے کہ ہم اس امر کو دنیا سے اسلام کا فتنہ اول قرار نہ دیں۔

اس وقت کی کارروائی ایک دوسرے اعتبار سے بھی فتنہ تھی اور وہ یوں کہ خلافت ایک ایسی امت کے لیے طے کی گئی کہ جس میں کے چند معمولی اشہاد ہی اس سے راضی تھے جنہیں حکومت کے امور اور سلطنت کے دستور میں کسی قسم کا دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہوتا ہے۔

یہی خلافتِ صدیق ہے کہ جب وہ سقیفہ کے باہر نکلتے تو عمر

ان کے آگے آگے چل رہے تھے اور اس قدر چلا رہے تھے کہ منہ سے جھاگ نکلا آتا تھا۔ ان کے ساتھ ایک جماعت تھی جو صنمانی چادریں اوڑھے ہوئے تھی۔ یہ جس کے پاس سے گزرتے تھے اسے مغبوط الحواس بنا کر اس کا ہاتھ کھینچ کر ابو بکر کے ہاتھ پر رکھ دیتے تھے چاہے وہ راضی ہو یا ناراض، اور یہی ان کی بیعت تھی۔
اس کا مطلب یہ ہے کہ،

حکام نے مسلمانوں کے سامنے ایسی خلافت پیش کی کہ جو نہ آسمان سے بابرکت قرار پائی اور نہ اس سے مسلمان راضی ہوئے، نہ اس کی پشت پر نبی رسولؐ تھی نہ اجماع امت۔

اس لیے کہ سعد نے تاحیات بیعت نہیں کی اور بنی ہاشم نے بقول بخاری چھ مہینے تک۔

کہا جاتا ہے کہ اہل حل و عقد کی بیعت کافی ہے۔

کیا یہ مفہوم محتاج شرح و تفسیر نہیں ہے؟

یہ کس نے کہا کہ ابو بکر کی بیعت کرنے والے اہل حل و عقد

تھے؟ یہ استعداد ان میں کس نے پیدا کی؟

یہ کام نہ تو نبیؐ نے کیا اور نہ امت نے! اس لیے کہ تاریخ بتاتی

ہے کہ اہل سقیفہ نے تو ابنِ انتخاب کی رو سے ایسی جماعت کا انتخاب ہی نہیں کیا جس کو

حاکم اعلیٰ کے انتخاب کا حق ہو اور اسے اہل حل و عقد سے تعبیر کیا جاسکے۔ نہ رسولؐ نے

کسی جماعت کو یہ لقب دیا ہے! سبھلایہ مسلمانوں کے لیے کیسے جائز ہو گیا کہ امور امت پر

کسی کو حاکم اختیار کریں۔ اس حالت میں کہ انہیں خود چناؤ کا حق ہو اور نہ امت نے

انہیں اس کام پر مقرر کیا ہو۔ کیا اسلام کا نظام حکومت یہی ہے؟

اصطلاح سیاست میں یہ بڑی پُر لطف بات ہے کہ :
 حاکم خود ہی اہل حل و عقد مقرر کرے اور پھر ان سے خود ہی انتخاب
 کرائے۔ اس سے زیادہ لطیف یہ بات ہے کہ علیؑ و عباسؑ و بنی ہاشمؑ و سعد بن عبادہ و زبیرؑ
 عمار و سلمان و ابوذر و مقداد اور جلد اہل عقل و رائے (بقول ابن عباسؓ) ملاحظہ ہو
 شرح بیح البلاغۃ معتزلی ج ۳ صفحہ ۱۱۵) کو اہل حل و عقد سے خارج کر دیا جائے (اگر یہ صحیح
 ہو کہ اسلام میں کوئی طبقہ اہل حل و عقد کا بھی ہے)
 اس ایک کلمہ نے مسلمانوں کو مجبور کر دیا کہ وہ اسلام کو نظماً
 اشترکیت کا نمونہ بنادیں۔ حالانکہ اس کو اسلام سے کوسوں کا لگاؤ بھی نہیں ہے۔
 حیف صدحیف!

کیا وہ بڑی بڑی دولتیں جن سے عبدالرحمن بن عوف اور طلحہ و زبیر
 کے خزانے بھرے ہوئے تھے ان کا کوئی سبب سوائے اس لقب کے کچھ اور بھی تھا۔
 کیا یہی وہ مبارک لقب نہ تھا جس نے ان میں احساس برتری
 پیدا کر دیا اور انھیں یہ خیال دلا دیا کہ تم امت اسلامیہ کے جملہ اموال میں تصرف کے
 حقدار ہو۔۔۔۔۔؟

کہا جاتا ہے کہ حکومت شرعیہ کا معیار اکثریت ہے اور اسی قانون پر اس
 حکومت کو قائم ہونا چاہیے۔

مگر لطف یہ ہے کہ قرآن کریم نے اکثریت کا بڑا استخفاف کیا ہے
 اور اس نے کسی حالت میں بھی اکثریت کو معیار و میزان نہیں قرار دیا جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے :
 ۱۰ اے رسول! اگر تم اکثر کا اتباع کرو گے تو یہ تمہیں

گمراہ کر دیں گے۔"

اکثر حق کو بڑا سمجھتے ہیں۔ اکثر خیالات کا اتباع کرتے ہیں۔ اکثریت جاہل ہوتی ہے۔

صحابہ سنت میں رسول اکرم سے روایت ہے۔ آپ فرماتے ہیں:
 ”جب میں حوض کوثر پر کھڑا ہوں گا تو ایک جماعت
 آئے گی جسے میں پہچانتا ہوں گا۔ ایک شخص کہے گا کہ ان کی منزل
 جہنم ہے میں سوال کروں گا۔ کیوں؟ جو اب ملے گا۔ یہ تمھارے
 بعد مرتد ہو گئے تھے۔ اب ان میں سے صرف چند اشخاص بچیں گے۔“

ظاہر ہے کہ اکثریت گمراہ اسلامی سلطنت کی بنیاد نہیں
 قائم کر سکتی اس لیے کہ ایسی اکثریت کی خلافت بھی ایسی ہی ہوگی۔

اگر ہم اکثریت کو اہل مدینہ کی ایسی اکثریت میں محدود نہ کریں بلکہ
 یہ کہیں کہ اکثریت مسلمان خلافت کا معیار ہے تو پھر یہ دیکھنا پڑے گا کہ کیا مدینہ ہی
 مسلمانوں کا مسکن تھا کہ وہاں کی اکثریت کی رائے حاصل کر لی گئی؟ یا ابوبکر نے خلافت
 کے لیے غیر مقامات پر خطوط لکھ کر ان کی رائے حاصل کی تھی؟

تاریخ بتاتی ہے کہ ایسا کچھ نہیں ہوا بلکہ پوری مملکت والوں پر خلافت
 کا تسلیم کرنا یوں فرم کیا گیا کہ اس میں کسی شک و انکار کی گنجائش ہی نہ رکھی گئی۔
 اور نہ اس کا موقع دیا گیا کہ کوئی پوچھ سکے۔ بلکہ بیعت میں تردد کو ایک ناقابل مغفرت
 جرم قرار دیا گیا۔

کہا جاتا ہے کہ خلافت بعض مسلمانوں کی بیعت سے حاصل ہو جاتی ہے۔ اور
 یہ بات ابوبکر کو میسر ہو گئی تھی۔ لیکن افسوس ہے کہ اس بات کو کوئی عقل سلیم اور منطوق
 صحیح تسلیم نہیں کرتی۔ بعض مسلمانوں کو کون سا حق ہے کہ وہ تمام مسلمانوں کے سر پر کسی
 کو حاکم بنا کر مسلط کر دیں؟

جہلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جہلا امور است ایسے کمزور دھاکے میں سلق کر دیے

۱۔ جیسا کہ فلک بن زبیرہ کے واقعات سے اندازہ ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو ”نفس واجتہاد“ (ترجمہ)

جا میں جو کچا ہو اور امت کو اپنے احکام و قوانین کے تحفظ کے لیے ایسے شخص کی طرف موڑ دیا جائے کہ جس کو چند آدمیوں نے بنا کر کھڑا کر دیا ہو؟

جس عدالت کی تصدیق نہ کسی نفس نبوی نے کی نہ اجماعِ قوی نے، بلکہ یہ ایک عوام کی جماعت جس میں بعض وہ بھی ہیں کہ جن کو قرآن نے سند دی ہے کہ یہ پیغمبر کو اذیت دیتے ہیں۔

خدا و رسول سے عہد کرتے ہیں کہ اب اگر اس کا فضل ہو گیا تو ہم صدقہ دیں گے اور صالح بن جائیں گے۔ لیکن جب مل جاتا ہے تو بخل کرتے ہیں اور منہ پھیر لیتے ہیں آخر کار ان کے دلوں میں نفاق راسخ ہو جاتا ہے۔ یہ وعدہ کے مخالف اور کاذب ہیں۔

بعض وہ بھی ہیں جن کے باطن کی تعریف قرآن نے کی ہے :

”اہل مدینہ میں سے بعض وہ ہیں جو نفاق پر اڑے

ہوئے ہیں، اے رسول تم نہیں جانتے لیکن ہم تو واقف ہیں۔“

ظاہر ہے کہ ایسی جماعت جس میں کچھ منافق، کچھ موزی اور کچھ کاذب ہوں، ان کا انتخاب کرنا عام مسلمانوں کے لیے واجب العمل اور قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ خواہ انھوں نے کسی غیاد پر انتخاب کیا ہو۔

اس سے بڑھ کر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ خلافتِ صدیق نہ خلافتِ نصیحی نہ اکثریت، نہ وہاں کوئی انتخاب ہوا تھا نہ اختیار۔ صرف اتنا ہے کہ اس کے سمجھے بعض لوگوں نے اپنی کوششیں صرف کیں۔ بعض نے اس کے گرد سجوم کر لیا۔ مدینہ کی کچھ پارٹیوں نے ساتھ دے دیا اور اس طرح چند مسلمانوں کی ایک خلافت تیار ہو گئی جن کا قول اس موضوع میں قطعاً ناقابل اعتبار ہے۔ اس لیے کہ وہ حکومت جس کی قومی امت سے حاصل ہوں اس کا حاکم بھی پوری امت یا اس کی اکثریت کا نمائندہ ہونا چاہیے۔

دوسری بات یہ ہے کہ

امت میں کچھ منافقین بھی ہیں جنہیں صرف قرآن جانتا ہے۔ اب اگر ہم یہ کہیں کہ اس اجتماع میں ایسا کوئی نہیں تھا تو اس کے لیے نص یا اجماع امت کی ضرورت ہوگی۔

اگر مجھے صدیق اجازت دیں تو میں قاطعہ زہرا کی رائے کی طرف کچھ یا پورا پورا میلان ظاہر کروں، اس لیے کہ میں اس سے بڑا کوئی فتنہ نہیں پاتا کہ ایک شخص بلاوجہ قانون امت پر مسلط ہو جائے اور اس کے دستور حیات میں صرف شروع کر دے، جیسا کہ صدیق نے اپنی پوری خلافت میں یا کم از کم عشرہ اول میں یا پھر ہفتہ اول میں کیا۔ جس کی تعبیر صدیقی نے فتنہ سے کی ہے۔

میں نہیں جانتا کہ وہ لوگ، جنہوں نے ان عناصر کو چھوڑ کر جنہیں اس موضوع میں واقعی رائے دینے کا حق تھا اپنی استبدادی خلافت بنالی تھی۔ ان کے ذہن میں یہ بات آئی تھی یا نہیں؟

یہ عناصر معارض ہوں گے، بنی اہم مقابلہ کریں گے۔
حالانکہ یہ بات بڑی حد تک منقول تھی، پھر ان لوگوں سے

کیونکہ احتیاط نہیں کی؟

ہم کیوں نہ اس موقفِ عظیم کی ویسی ہی تعریف کریں جیسی کہ فاروق نے اس وقت کی جب انہوں نے فرمایا کہ اب ایسا اقدام کرنے والا مستحقِ قتل و موت ہے۔
اگر ہم اس کلام کو یہ خیال کر کے کہ ایک قائد امت کا قول ہے اس کی تحلیل کریں تو صاف معلوم ہو جائے گا کہ فاروق کی نظر میں خلافت صدیق فتنہ و فساد تھی اس لیے کہ قبل مسلم بغیر ان امور کے ناجائز ہے، بلکہ یہ فتنہ امم الفتن ہے کہ جس نے سلطنت الیہ

کو ہرنیک وید، صالح و ظالم کے حوالہ کر دیا۔
 جیسا کہ حضرت عائشہ نے جو اس حاکم جماعت کی نمائندہ اور
 ترجمان تھیں کہا کہ :

”یہی وہ فتنہ ہے جس نے طبع و حرص، ہوا و ہوس
 کا وہ میدان قائم کر دیا جس میں مختلف جماعتیں اور مقتدر
 سیاستیں پیدا ہوئیں۔ مسلمانوں میں افتراق اور اجتماعِ اسلامی
 میں ایسا انقسام پیدا ہو گیا کہ جس سے اس کا اسلامی وقار
 ہمیشہ کے لیے ان سے رخصت ہو گیا۔“

آپ کیا خیال کرتے ہیں اس امت کے بارے میں جس نے
 چوتھائی صدی میں اسلام کی عظیم ترین حکومت قائم کر دی، صرف اس خاموشی کے تصدیق
 میں جو علیؑ نے اختیار کی، جس نے حکومت کی بنیادوں کو مستحکم کر دیا اور حکام کو آگے
 بڑھنے کا موقع دیا۔

آپ ایسی امت کا کیا وقار اور اس کی دنیا میں کیا عظمت سمجھتے ہیں؟
 یہ رائے اس وقت قائم کیجیے،

جب آپ کے دل میں ان سلاطین کی محبت نہ ہو جن کا کام
 ضرر رسانی، امت، جن کا مشغلہ شراب و کباب، جن کی زندگی جنگ و جدل تھی۔
 جنہوں نے تاریخِ اسلام کے چہرے کو اپنے کردار سے بدنام
 بنا دیا اور امت کے پورے وقار کو کھو دیا۔

انسوس کہ صدیق و فاروق نے صرف اپنے زمانے کا سطل

کیا اور یہ سمجھے کہ میری خلافت دستورِ اسلامی کی حمایت کرے گی۔
کاش!

وہ مستقبل پر بھی ایک نظر ڈالتے تو انہیں وہی خطرات
نظر آتے جنہیں فاطمہ زہراؑ حرمِ معرفت سے دیکھ رہی تھیں۔

اور

جن سے فاطمہؑ امتِ اسلامیہ کو آگاہ کر رہی تھیں۔



مقدمہ فدک

خلیفہ اپنی رد میں

مسئلہ اول :- اگر ہم اپنی بحث کو ایک حد تک دقیق بنانا چاہتے ہیں تو ہمیں علمی بحث کے قوانین پر دو باتوں کو پرکھنا پڑے گا۔ میراث فاطمہ کے مقابلہ میں خلیفہ کا موقف، جس میں انہوں نے اپنی اس حدیث پر اعتماد کیا تھا جو انہوں نے اس موضوع میں مختلف اسلوب اور متعدد اشکال کے ساتھ پیش کی۔

زمانہ حاضر میں بھی وہ روایت نقل کی جاتی ہے لیکن مختلف عباراتوں کے ساتھ اور متعدد شکلوں میں۔ یا اس لیے کہ خلیفہ نے مختلف موقعوں کی مناسبت سے الفاظ میں تبدیلی پیدا کر دی تھی یا اس لیے کہ روایت ہی پیغمبر اسلام سے متعدد الفاظ میں وارد ہوئی ہے۔ اس مسئلہ میں چند امور قابل غور ہیں :

①

یہ دیکھنا ہے کہ جس حدیث سے خلیفہ نے بنت رسول کو ترک نہوت سے محروم کر دیا اس پر خود انہیں کتنا اعتماد تھا۔ روایت یہ تیا تھی ہے کہ ابو بکر نے صدیقیہ کو

فدک دے دیا تھا لیکن درمیان میں عمر آگئے اور کہا کہ مسلمان کیا کھائیں گے؟ اور یہ کہہ کر قبائل فدک کو پارہ پارہ کر دیا۔

ہم اس روایت کو ایک حد تک ماننے لیتے ہیں، اس لیے کہ اگر آپس کچھ قوت نہ ہوتی تو اس وقت کے حالات اسے ہرگز نہ بیان ہونے دیتے اور اگر یہ حدیث صحیح ہے تو ظاہر ہے کہ یہ داستان قبولیت حضرت فاطمہؑ کے خطبہ اور ابو بکر کی حدیث دونوں کے بعد کی ہے۔ اس لیے کہ مرتدین کی جنگ کہ جس کے لیے عمر کو سرسرایہ کی ضرورت تھی سقیفہ کے دس دن کے بعد سے شروع ہوئی اور اس طرح خطبہ فاطمہؑ زہراؑ بھی دسویں دن کا واقعہ ہے۔

۲

خلیفہ نے وقت و فات فاطمہؑ کو فدک نہ دینے پر ندامت کا اظہار کیا تھا۔ بلکہ ایک وقت تو اس قدر متاثر ہو گئے تھے کہ خلافت سے استعفیٰ دے رہے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خلیفہ کے دل میں ایک عجیب اضطراب تھا جس کا سبب یہ احساس تھا کہ ہم نے فاطمہؑ کے فیصلے میں غلطی سے کام لیا ہے اور جس مدد پر اعتماد کیا ہے وہ بالکل بے بنیاد ہے۔

یہ بات اکثر ان کے دل میں ہیجان پیدا کرتی تھی جس سے سکون کا کوئی ذریعہ انہیں نہ ملتا تھا۔ یہاں تک کہ پیمانہ برداشت لبریز ہو گیا اور وقت آخر انہیں اس اضطراب و قلق کا اظہار ندامت کی شکل میں کرنا پڑا۔

۱ سیرۃ حلبیہ ج ۳ ص ۲۹۱

۲ مروج الذهب ج ۳ ص ۱۹۳

۳ عمرا صنی فی صموالذات، شیخ عبداللہ العلامی ص ۱۵۸

یہ ایک ناقابل فراموش حقیقت ہے کہ ابو بکر نے جو اہل رسولؐ میں دفن ہوئے
کی وصیت کی تھی اور یہ بات اس وقت تک صحیح نہیں ہو سکتی جب تک کہ اپنی روایت کے
اعتبار سے دست بردار نہ ہو جائیں جس کو انھوں نے قانونی مدرک قرار دیا تھا اور اپنی دختر
سے اجازت نہ لے لیں کہ جس کے حصہ میراث میں دفن ہونا چاہتے ہیں (اگر زمین کی میراث
زوجہ کو ملتی ہو اور عائشہ کا حصہ اس قدر طویل کے لیے کافی ہو)

ورنہ اگر ان کی یہ رائے باقی رہی کہ ترکہ بنی صدقہ مسلمان ہے
تو انھیں تمام مسلمانوں سے اجازت لینے کی ضرورت تھی اور اگر یہ بھی فرض کر لیا جائے کہ
انھوں نے بالتین سے اجازت لے لی ہوگی تو سوال یہ ہے کہ نابالغ اور قاصرین کے حقوق
ان کے لیے کس نے صالح کر دیے؟

ہماری بحث اور موقفِ خلیفہ

ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ خلیفہ نے ازواجِ نبیؐ سے ان کے وہ مکانات نہیں
سلب کیے جن میں وہ حیاتِ نبیؐ اکرمؐ میں سکونت پذیر تھیں۔
کوئی بتائے کہ احسنہ یہ تفریق کیوں؟

ناظر کا مال تو نے کہ مصالحِ مسلمین میں صرف کیا جائے اور ازواج
کو ان کے اموال میں مطلق العنان قرار دیا جائے۔ یہاں تک کہ عائشہ سے دفن کی
اجازت ل جائے؟

کیا حکمِ عدمِ وراثت فقط بقتلہ البتہ سے مخصوص تھا؟ یا ازواج کے
مکانات انھیں بطور عطیہ ملے تھے؟ اگر ایسا ہے تو اس پر خلیفہ کے پاس کیا دلیل تھی؟

حالانکہ نہ کسی نے دعویٰ کیا اور نہ گواہی دی۔

اور ظاہر ہے کہ حیاتِ رسولؐ کا قبضہ دلیلِ ملکیت نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ وہ قبضہ زوجیتِ پیغمبرؐ کی وجہ سے تھا۔ جیسے کہ شوہر و زوجہ کی شان ہوتی ہے۔ اسی طرح مسلمان میں مکانات کی نسبت ازواج کی طرف دلیلِ ملکیت نہیں ہے اس لیے کہ نسبت کے لیے معمولِ مناسبت بھی کافی ہے جیسا کہ قرآن نے چند آیات کے بعد انہیں مکانات کو رسولؐ کی طرف منسوب کر دیا ہے۔

اگر ترتیبِ قرآنی محبت ہے تو یہ آیت بھی دلیل ہے۔ مکانات کی نسبت ازواج کی طرف فقط سکونت کی بنا پر تھی نہ کہ ملکیت کی بنا پر۔ اس کے علاوہ صحاحِ المہنت میں بیت کی نسبت پیغمبرؐ کی طرف بکثرت ملتی ہے۔

”میرے بیت و منبر کے درمیان ایک باغِ جنت ہے“

۵

ہم یہ پوچھتے ہیں کہ عدمِ میراث کا قانون اگر وحیِ الہی ہے تو اسے پیغمبرؐ نے کیوں نہیں بیان کیا؟ اور یہ صرف جنابِ فاطمہؑ پر کیوں جاری کیا گیا؟ باقی انبیاء نے یہ حکم کیوں نہیں لگایا؟

یا یہ کہ انبیاء نے اس حکم کو صرف اس لیے نہیں بیان کیا کہ مالِ دنیا ان کی اولاد میں محفوظ رہے؟

یا یہ کہ انبیاء نے اس پر عمل کیا لیکن تاریخ نے اس کا ذکر نہیں کیا؟

یا یہ ————— کہ یہ حکم سیاستِ وقت کی تازہ پیداوار ہے؟

۶

کیا یہ ممکن ہے کہ پیغمبرؐ اپنی محبوب ترین بیٹی کو مصائب و شدائد میں مبتلا کرے۔

اسے اس روایت کی بنا پر بعض علماء نے یہ احتمال دیا ہے کہ شاید جنابِ فاطمہؑ کی قیاسی مقام پر ہے (مترجم)

صرف اس لیے کہ اسے حکم سے آگاہ نہ کرے۔ حالانکہ یہی وہ بیٹی ہے کہ جس کے غضب و مسرت پر پیغمبر اکرمؐ کے رنج و خوشی کی بنیاد ہے۔

کیا یہ سقیم کو اچھا معلوم ہوتا تھا کہ ان کی بیٹی بچھڑے دربار میں رسوا ہو اور اسے مسلمانوں کے مجمع میں ذلیل کیا جائے اور اس کے بعد مسلمانوں میں ایک عظیم اختلاف پیدا ہو جائے۔ حالانکہ وہ رحمت اللعالمین تھے۔

روایات خلیفہ اور ہماری تنقید

اگر ہم ان احادیث کو جو اس موضوع میں پیش کی گئی ہیں، معنوی اعتبار سے پرکھنا چاہیں تو ہمیں دو قسموں میں منقسم کر دینا پڑے گا:

قسم اول:

بعض احادیث میں ہے کہ ابو بکر نے کلامِ فاطمہؑ کو سن کر گریہ کیا اور کہا۔ اے بنتِ رسولؐ! تمہارے باپ تھے دنیا و دہریم کو میراث نہیں بنایا اور یہ فرمایا ہے کہ:

« انبیاء کا کوئی وارث نہیں ہوتا۔ »

اور اس کے بعد اپنے خطبہ میں کہا کہ میں نے رسول اللہؐ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ ہم گروہ انبیاء، سونا چاندی، زمین و جائیداد کا وارث نہیں بناتے، ہماری میراث ایمان و حکمت علم و سنت ہے۔

قسم دوم:

عبارتِ معروف اور وہ یہ کہ پیغمبرؐ نے فرمایا ہے کہ ہم وارث نہیں بناتے جو چھوڑیں وہ صدقہ ہے۔

یا ہم جس مال کو بطور صدقہ چھوڑتے ہیں اس کا

وارث نہیں بناتے

سب سے اہم بات اس مقام پر یہ معلوم کرنا ہے کہ حدیث کی دلالت ، عدم وراثت پر یقینی ہے کہ قابل شک و شبہ نہ ہو؟ یا صرف ظاہری ہے کہ اس کے دوسرے معنی بھی مراد ہو سکتے ہیں؟ یا مجمل و مشتبہ ہے کہ کوئی بات واضح طور پر معلوم نہ ہوتی ہو؟

قسم اول کی احادیث کا عنوان بتاتا ہے کہ اس میں دو احتمال ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مقصود معنی ارث ہو، جیسا کہ خلیفہ نے خیال کیا اور یہ بھی ممکن ہے کہ پیغمبرؐ بتانا چاہتے ہوں کہ مقایم نبوت بہت بلند ہے۔ اس کی شان یہ نہیں ہے کہ مال دنیا اور ثروت مادی کو جمع کرے۔

شاید رسول اکرمؐ کا اشارہ اس بات کی طرف رہا ہو کہ انبیاء مלאئکہ صفت بشر ہیں۔ ان کے یہاں مادی انانیت بشری خواہشات کا گزرو نہیں۔ یہ آسمانی مخلوق ہیں ان کوارضی مادہ سے کوئی علاقہ نہیں۔ یہ منیع خیر، مطلع نور، مورث ایمان و حکمت اور اس سلسلہ سلطنت الہیہ ہیں۔ یہ سراپہ وار و نفائس دنیا کے طماع نہیں ہوتے کہ درہم و دینار سونا چاندی زمین و جانہ و امبیا کر کے اپنی میراث بنائیں۔ اس لیے کہ میراث مال جمع کرنے کے بعد ہوگی اور یہ امور ان سے کہیں بلند ہیں۔ ان کی نظر میں مال دنیا بے قیمت اور ثروت مادی بے وقار ہے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ عدم ارث کا حکم بوجہ عدم مال کیا گیا ہو۔ جیسے کہ ہم کہیں کہ فقر ارث کا کوئی وارث نہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان کے لیے آسمان سے کوئی خاص حکم اترا ہے۔ بلکہ مقصود یہ ہوگا کہ یہ مال ہی نہیں رکھتے۔ اسی طرح مقصود پیغمبرؐ یہ ہے

لے اصل عبارت یہ ہے: لانورث ولا نورث ماترکناہ صدقۃ^۱ اب اگر ماترکناہ صدقۃ کو مستقل جملہ خیال کریں تو پہلے معنی صحیح ہوں گے اور اگر اس جز کو لانورث کا مفعول قرار دیں تو دوسرے معنی پیدا ہوں گے۔ (مترجم)

کہ انبیاء کو مادی دولت و ثروت سے رغبت نہیں ہوتی کہ وہ وارثتِ مال بنائیں رہاں اگر کوئی مال اپنی ضرورت سے بچ گیا تو اس کا وارثتِ ضروری بنائیں گے)

حدیث کا یہ مطلب اگرچہ ذہن عام سے بعید ہے مگر مذاقِ رسالت سے بہت قریب ہے اس لیے کہ کلامِ رسول کو ایسے گہرے معانی اور باریک مطالب پر بھی مشتمل ہونا چاہیے کہ جسے عامۃ الناس نہ معلوم کر سکیں)

اگر آپ میرے معنی سے اتفاق کرنا چاہتے ہیں تو پہلے تو ریثت کے معنی معلوم کریں کہ جس کی نفی کی گئی ہے تاکہ مطلب واضح ہو سکے۔

توریثت کے معنی ہیں کسی شے کا میراث بنانا۔
اور مورث وہ شخص ہے جو مال کے میت سے وارثت کی طرف انتقال کا سبب ہو۔

یہ انتقال دو باتوں پر موقوف ہے۔

اول وجود ترکہ ، دوم قانون کہ جو وارثت کو مال سے حصہ نلانی۔
پہلی بات مرنے والے کی طرف سے ہوگی اور دوسری بات کا تعلق اس شریعت سے ہے کہ جس نے قانونِ میراث کو وضع کیا ہے۔ خواہ وہ کوئی ایسا انسان ہو جسے لوگوں نے حق قانون سازی دیا ہو یا کوئی جماعت ہو یا کوئی نبی ہو جو وحی آسمانی سے احکام وضع کرتا ہے۔
اگرچہ میت اور قانون ساز دونوں ہی کو میراثت میں دخل ہے۔ لیکن مورثت درحقیقت مرنے والے ہی کو کہیں گے جس نے مادۂ ارثت کو جمع کر کے میراثت کے شرائط جمع کیا کیے ہیں۔ برخلاف حاکم کے کہ اس نے قانون وضع کر کے کوئی میراثت نہیں بنائی۔ بلکہ صورت ایک نظام بنا دیا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ جب کوئی مرنے والا مال چھوڑے گا تو اس کے پس ماندگان وارثت ہوں گے۔

ظاہر ہے کہ اس نظام سے مال موجود نہیں ہو سکتا۔ بلکہ ضرورت

اس امر کی ہے کہ میت کچھ جمع کر کے چھوڑ گئی ہو۔

حاکم کی مثال بالکل اس شخص کی ہے جس نے آگ جلانے کے اسباب جیسا کہ دیئے ہوں۔ اب اگر آپ نے کاغذ ڈال دیا اور وہ جل گیا تو یہ فعل آپ کی طرف منسوب ہوگا۔ اس سے اس امر کا کوئی تعلق نہ ہوگا کہ جس نے آگ روشن کی ہے۔ اس لیے کہ ہر شے اپنی آخری علت کی طرف منسوب ہوتی ہے۔

اس قاعدہ کی بنا پر کسی شخص کی طرف نسبت تو ریث یہ بتاتی ہے کہ میراث کا براہ راست سبب یہی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ وہی شخص ہوگا جس نے مال جمع کیا ہے۔ اس سے مراد وہ شخص نہیں ہو سکتا جس نے تمام اموال سے قطع نظر صرف ایک قانون بنا دیا ہے۔

اب "الانشیاء یورثون" کا مفہوم یہ ہوگا کہ

انبیاء مال و دولت جمع کر کے اسے ترک قرار دیتے ہیں اور اس کی نفی کا مطلب یہ ہوگا کہ ان کی شان جمع اموال اور تحصیل ثروت سے بلند و بالا ہے وہ میراث کے لیے سنی نہیں کرتے۔

نتیجہ یہ نکلا کہ عدم تو ریث انبیاء کا مفہوم کوئی جدید قانون نہیں ہے جو صرف ان کے لیے بنایا گیا ہو، اس لیے کہ یہ تو ریث مجازی ہے۔ بلکہ اس کا مطلب اموال کا جمع نہ کرنا ہے جو کہ تو ریث حقیقی ہے۔

خبر ہو کہ وراثت و وصیوں پر موقوف ہے ایک یہ کہ انسان میراث بنانے کے لیے مال و دولت جمع کرے اور دوسرے یہ کہ قانون کی رو سے یہ مال پسماندگان کی طرف منتقل ہو جائے۔ لہذا ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ رسول اکرم کا یہ ارشاد کہ ہم انبیاء وراثت نہیں بناتے پہلے مطلب کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی ہماری نظر دولت دنیا پر نہیں ہوتی اور نہ ہم اسے جمع کرتے ہیں گو اپنے وراثت کے واسطے یہ ذخیرہ چھوڑ جائیں اور خلیفہ کا دعویٰ یہ ہے کہ اس کی مراد دوسرے معنی میں یعنی ہم انبیاء کو قانونی اختیار ہی نہیں ہے کہ ہمارا مال میراث بن سکے۔ (مترجم)

دوسرے الفاظ میں یوں کہا جائے کہ اگر عدم توریت سے مراد توریت قانونی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جملہ آسمانی شریعتیں باطل ہیں۔ اس لیے کہ قانون کا تعلق صرف اپنے ورثا سے نہیں ہوتا بلکہ وہ تمام عوام کے لیے بنایا جاتا ہے۔

اور اگر مراد عدم توریت حقیقی ہے تو صدیق کا دعویٰ باطل ہو جائے گا اور نتیجہ یہ ہوگا کہ انبیاء مال ہی جمع نہیں کرتے، نہ یہ کہ موجودہ مال بھی صدقہ بنا کر چلے جاتے ہیں۔

پہلی روایت میں خلیفہ نے تمہیداً یہ کہا تھا: سیدنا تمہارے باپ نے ربیع و ربیعہ کو میراث نہیں بنایا۔ جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ پیغمبر نے کوئی مال چھوڑا ہی نہیں ہے جسے میراث بنایا جائے۔

اگر خلیفہ اس جملہ سے وہ معنی مراد لے سکتے ہیں جو ان کے موافق ہوں تو ہم بھی حدیث کا یہی مفہوم تسلیم کر سکتے ہیں کہ جو ہمارے موافق ہے۔

اگر ہم ان مثالوں کا بھی لحاظ کریں جو دوسری حدیث میں بیان کی گئی ہیں تو ہمارے معنی کی قیمت اور بڑھ جائے گی اس لیے کہ سونا چاندی، گھڑ و جانیداد کا تذکرہ خلیفہ کے معنی کے ساتھ سازگار نہیں ہے۔ اس لیے کہ اگر عدم ارث کے قانون کا بیان مقصود ہوتا تو معمولی سے معمولی چیز کا ذکر کیا جاتا تاکہ معلوم ہو کہ انبیاء کسی شے کا وارث نہیں بناتے۔

مثلاً اگر ہم کہیں کہ کافر اولاد سونا چاندی کے وارث نہیں تو فوراً یہ خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ معمولی چیزوں کے ضرور ہوں گے۔ لہذا اگر یہ بیان کرنا چاہیں کہ وہ کسی شے کے وارث نہیں تو کترین اشیا کا ذکر کریں گے۔

خلاصہ یہ ہے کہ قانون عدم ارث کی توضیح موقوف ہے اس بات پر کہ ایسی اشیا کا ذکر کیا جائے جن کو عموماً ترکہ میں حساب بھی نہیں کیا جاتا نہ کہ

نہیں اور بیس قیمت اشیا کا کہ جن سے معمولی اشیا کی میراث ثابت ہو جاتی ہے۔
ان قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام کا مقصد انبیاء کا زہد اور مال
دنیا سے ان کی علیحدگی کا بیان کرنا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس مقصد کے لیے عمدہ اشیا کا ذکر
زیادہ مناسب ہے تاکہ یہ ظاہر ہو سکے کہ جب یہ حضرات عمدہ چیزوں کو جمع نہیں کرتے تو
معمولی اشیا کو کیونکر جمع کریں گے۔

۷

ہمارے بیان کا شاہد اسی حدیث کا وہ جملہ بھی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ انبیاء
ایمان و حکمت کا وارث بناتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ اس فقرے سے مراد نئے قانون کا وضع کرنا نہیں ہے
بلکہ مقصود یہ ہے کہ انبیاء ایمان و حکمت کی اس منزل پر ہوتے ہیں جو انہیں اس قابل بنا
دیتی ہے کہ اپنے مزارع کو منتر کر سکیں اور انہیں بطور میراث دوسروں تک پہنچا سکیں۔
اس فقرہ سے پہلے فقرہ کا مطلب بھی واضح ہو جاتا ہے کہ وہ
مال کو زیادہ جمع ہی نہیں کرتے کہ اس کو منتشر کریں اور اپنے بعد کے لیے اس کا کسی
کو وارث بنائیں۔

۸

اگر یہ کہا جائے کہ کلام رسول اسلام "کافر اولاد وارث نہیں ہوتی"
سے ہم ایک قانون سمجھتے ہیں تو اسی طرح اس فقرہ حدیث کا مفہوم بھی ہونا چاہیے۔
تو اس کا جواب یہ ہے کہ

ان دونوں کلاموں میں ایک واضح فرق ہے اور وہ یہ کہ واضح
قانون جب اپنے ماتحت افراد کے متعلق کوئی خبر دیتا ہے تو اس سے یہ خیال ہوتا ہے کہ
یہ خبر کے ذریعہ کوئی حکم نافذ کرنا چاہتا ہے لیکن اگر اپنے سے غیر متعلق افراد کے متعلق کوئی

خبر دے تو وہاں یہ تصور لٹو ہوتا ہے۔

ظاہر ہے کہ اس کلام میں اپنی شریعت کے کافر تجڑوں کی خبر ہے۔ لہذا یہ ایک حکم شرعی بن جائے گا۔ لیکن اس حدیث میں انبیاء گزشتہ کی بھی خبر ہے اور ان کے لیے اب کسی قانون کے وضع کرنے کا عمل باقی نہیں رہ گیا ہے۔ جبکہ وہ دنیا سے گزر چکے ہیں۔ لہذا معلوم ہوتا ہے کہ دونوں فقروں کا مفہوم جداگانہ ہے۔

۹

آپ یہ اعتراض نہیں کر سکتے کہ کیونکہ انبیاء نے مال دنیا جمع کیا ہے اس بنا پر یہ حدیث بھوٹی ہے۔ اس لیے کہ حدیث میں توریث کی نفی کی گئی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ میراث کی نسبت انبیاء کی طرف نہیں ہے کہ انھوں نے مال تلاش کر کے جمع کیا ہوتا کہ کسی کو اپنا وارث بنا لیں۔

انبیاء کرام اگرچہ دار دنیا میں سیم و زر کے مالک تھے لیکن نہ اس لیے کہ انھوں نے اس کے پیچھے گردش کی ہو، جیسا کہ عادتہ الناس کا طریقہ ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ممکن ہے کہ اس کلام کو رسولؐ نے کنایہ فرمایا ہو جس سے مقصود اس کے لفظی معنی اصلاً نہ ہوں بلکہ مراد زہد انبیاء ہو۔ اس صورت میں مال دنیا کا ان کے پاس جمع ہونا حدیث کی صحت کے لیے قطعاً مضر نہیں ہے۔

جیسا کہ زمانہ قدیم میں کریم انسان کو زیادہ خاکستر والا کہا کرتے تھے اور یہ کلام صحیح تھا۔ اگر وہ کریم ہو خواہ اس کے گھر میں راکھ نہ بھنی ہو۔ اس لیے کہ مراد معنی لفظی نہ تھے بلکہ یہ ایک کنایہ تھا۔

اسی طرح اس حدیث میں مراد بیان زہد انبیاء ہے خواہ ان کے پاس مال دنیا ہو یا نہ ہو۔

غلامہ کلام یہ ہے کہ انبیاء کے اموال کی دو توجیہیں ہو سکتی ہیں۔ یا تو یہ

کہا جائے گا کہ یہ مال اس طرح نہیں جمع کیا گیا جس طرح لوگ اپنی اولاد کی خاطر جمع کرتے ہیں۔ یا یہ کہا جائے گا کہ روایت میں برات کی نفی سے مراد صرت انبیاء کے زہد و تقویٰ کا بیان کرنا ہے، خواہ ان کے پاس ساری کائنات کی دولت موجود ہو۔

۱۰

اگر ہم حدیث کی قسم دوم کا مطلب معلوم کرنا چاہیں تو ہمیں حسب ذیل تین مسائل میں فرق کرنا چاہیے :

① — ترکِ میت میراث نہیں بنتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر وہ شے جو وقتِ وفات تک مرنے والے کی ملکیت تھی اور جسے وہ چھوڑ کر گیا ہے میراث نہیں ہے۔ یہ معنی اس وقت ہوں گے جب "ما ترکناہ صدقۃ" کو الگ جملہ فرض کریں گے۔

② — ہر وہ شے جسے میت نے اپنی حیات میں صدقہ کر دیا ہے یا وقف کر دیا ہے وہ میراث نہیں بن سکتی بلکہ صدقہ و وقف ہی ہے گی اور ورثا "غیر صدقہ" اموال کے وارث ہوں گے۔ یہ معنی اس وقت ہوں گے جب "ما ترکناہ صدقۃ" کو تتمہ کلام تسلیم کر دیں گے۔

③ — فلاں شخص کے پاس اپنا ترکہ نہیں ہے کہ میراث بنے، بلکہ اس کے جملہ متروکہ اموال صدقات و اوقاف کے ہیں۔ یہ معنی اس وقت ہوں گے جب "ما ترکناہ صدقۃ" کو ایک علیحدہ خبر فرض کریں گے جس کو قانون سے کوئی تعلق نہ ہو گا۔

جب ہمیں ان عبارات کا فرق معلوم ہو گیا تو یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ الفاظِ حدیث کا مطلب نہایت ہی مجمل و مشتبہ ہے جو تینوں مسانئ پر منطبق ہو سکتا ہے۔

اس لیے کہ حدیث کا دوسرا فقرہ "ما ترکناہ صدقۃ" اگر متقل طور پر مبتدا اور خبر متراویا جائے تو اس کا مفہوم یہ ہو گا کہ :
 "ملک میت میراث نہیں بلکہ صدقہ بن جائے گی۔"
 اور یا یہ ہو گا کہ :

"میت کسی شے کی مالک نہیں ہے بلکہ اس کا جملہ

ترکہ صدقہ ہے جو اس نے جمع کر رکھا ہے۔"

اور اگر اس فقرہ کو پہلے فقرہ کا تتمہ متراویا جائے تو

اس سے مراد دوسرے معنی ہوں گے، یعنی یہ کہ :

"وہ مال جسے میت نے اپنی زندگی میں تصدق کر دیا

ہے وہ میراث نہیں ہے۔ باقی اموال میراث بن سکتے ہیں۔"

اس صورت میں ما ترکناہ مفعول ہو گا، مبتدا نہ ہو گا

بلکہ اس فقرہ کو لپٹ کر کہا جائے ما ترکناہ صدقۃ لا نورث تو اس کا مفہوم بھی یہی ہو گا جو بیان کیا گیا ہے۔

تو جس طرح عکس کلام کا مطلب یہ ہے کہ صدقہ میراث نہیں بنتا

اسی طرح اصل کلام کا مطلب بھی یہی ہو گا۔ یہ مطلب نہیں ہو سکتا کہ (میراث صدقہ

بن جاتی ہے) لہذا اب یہ حدیث صدقہ کے میراث ہونے کی نفی کرے گی نہ کہ انبیاء کے

لیے نئے قانون کی بنیاد ہوگی۔

اب ہم علم نحو سے دلچسپی رکھنے والے افراد کا لحاظ کرتے ہوئے اعراب بھی

کیے دیتے ہیں۔ پہلی صورت میں صدقہ پر "پیش" ہو گا۔ اس لیے کہ خبر ہے۔ اور دوسری

صورت میں اس پر زبر ہوگا۔ چونکہ تمییز ہے اور یہ فرق ہمارے مطلب کے لیے مضر نہیں ہے اس لیے کہ وقت تکلم اکثر اعراب ظاہر نہیں ہوتا۔ یا مخصوص کلمات کے آئینہ میں۔

(۱۱)

جب ہم نے معنی روایت کے مختلف احتمالات آپ کے سامنے پیش کر دیے تو اب اگر ہم اس امر کا دعویٰ کریں کہ روایت صراحتاً خلیفہ کے مقصد پر دلالت نہیں کرتی تو ہرگز بے جا نہ ہوگا۔ بلکہ میرا دعویٰ یہ تو ہے کہ میرے معنی (صدقہ میراث نہیں بنتا) خلیفہ کے معنی (میراث صدقہ بن جاتی ہے) سے کہیں زیادہ بہتر ہیں۔

اس لیے کہ حدیث میں ضمیر جمع ہے اور جمع کا استعمال فرد واحد میں مجاز ہے جو اگرچہ مقام تعظیم میں استعمال ہوتا ہے لیکن یہ بات شان انکسار پیغمبر اسلام سے بہت زیادہ بعید ہے۔ بتائیں ظاہر لفظ کا تقاضا یہ ہے کہ لفظ کو جماعت کے لیے استعمال کیا جائے اور تنہا پیغمبر کے لیے مخصوص نہ کیا جائے اور اصول تکلم یہ بتاتے ہیں کہ اس جماعت سے مراد جماعت مسلمان ہے نہ کہ جماعت انبیاء۔ اس لیے کہ یہ حدیث ذکر انبیاء سے خالی ہے اور اس سے قبل بھی ان کا کچھ ذکر نہ تھا۔

اب اگر آپ یہ احتمال دیں کہ شاید وقت تکلم رسول اکرم کوئی قرینہ رہا ہو جو اس امر پر دلالت کر رہا ہو کہ مراد جماعت انبیاء ہے کہ روایت کو مع جملہ قرآن کے بیان کرے۔ اور جب انھوں نے بیان نہیں کیا تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس قسم کا کوئی قرینہ وقت تکلم بھی نہ تھا۔

مزید برآں یہ کہ ایسے قرینہ کا حذف کر دینا مطلوب خلیفہ کے خلاف بھی تھا لہذا اگر کوئی ایسی شے ہوتی تو وہ ضرور بیان کرتے معلوم ہوتا ہے کہ یہ روایت بعینہ انھیں حدود کے ساتھ بلا زیادتی دیکھی صادر ہوئی تھی۔

میں نے جماعتِ مسلمین کو اس لیے مقصود قرار دیا ہے کہ یہ رسم دنیا ہے کہ جب کوئی شخص جمع میں گفتگو کرتا ہے اور جمع کے الفاظ استعمال کرتا ہے تو اس سے مراد وہی جماعت ہوتی ہے جو نگاہوں کے سامنے موجود ہو۔

مثلاً کوئی عالم ایک اجتماعِ احباب میں بیٹھ کر کوئی بات کہے اور وہ جماعت سے متعلق ہو تو ظاہر ہے کہ اس سے مراد وہی احباب کی جماعت ہوگی جو نگاہوں کے سامنے موجود ہو نہ کہ علماء کی جماعت۔ بلکہ اگر اس کے مقصود علماء ہوں اور بیان نہ کرے تو یہ معصوم ہو کر رہ جائے گا۔

جب یہ واضح ہے کہ حدیث سے مراد جملہ مسلمان ہیں تو اب کیا اس حدیث کا مفہوم یہ ہوگا کہ مسلمان میت کا کوئی وارث نہیں ہوتا؟ یا یہ کہ مسلمان جو کچھ چھوڑ کر مرے سب صدقہ ہے، ترک نہیں؟

حاشا وکلا! یہ تو ضروریاتِ دینِ اسلام کے خلاف ہے اس لیے کہ مسلمان، نبضِ قرآن مختلف اسباب سے اموال کا مالک ہوتا ہے اور بعدِ مرگ اس کے ورثاء اس کے مال کے وارث ہوتے ہیں۔

ہاں! اگر یہ مفہوم لیا جائے کہ صدقہ میراث میں داخل نہیں تو اس میں کوئی حشر الی نہیں۔ یہ ایک عام اسلامی اصول ہے جو جملہ صدقاتِ مسلمین میں رائج ہے۔ یہ بھی کوئی عجیب بات نہیں کہ صدقہ کے میراث نہ ہونے کا حکم جو کہ اس قدر واضح ہے یہ صدر اسلام میں اس قدر واضح نہ تھا کہ محتاج بیان نہ ہو۔ اس وقت یہ احتمال بہت قوی تھا کہ صدقات و اوقاف بعدِ مرگ ختم ہو جائیں اور اموال میراث بن جائیں۔

میرے اس سنی کی رو اس بات سے نہیں ہو سکتی کہ اسے فاطمہ زہراؑ نے خلیفہ کے سامنے بیان نہیں کیا۔ اس لیے کہ اس کی چند وجوہ ہیں:

① — وہ سخت موقع جس میں فاطمہ زہراؑ نے قیام کیا تھا اس میں اتنی

گنجائش نہ تھی کہ ایسے دقیق اعتراضات کیے جائیں۔ اس لیے کہ حکومت وقت کا مطلب یہ تھا کہ جلد سے جلد صورت حال پر قابو حاصل کر لے یہی وجہ ہے کہ جب منہ زار نے آیات قرآنیہ کو استدلال میں پیش کیا تو خلیفہ نے سوائے ان ہاں کے کوئی جواب نہ دیا (ملاحظہ ہو طبقات ابن سعد) ظاہر ہے کہ ایسے حالات میں ان اعتراضات کا جواب صرف یہ ہوتا کہ ہم نہیں مانتے، لہذا ان کا بیان کرنا لائق تھا۔ ان اعتراضات کو فاطمہ زہرا کے مقصد سے کوئی لگاؤ بھی نہ تھا اس لیے کہ ان کا مقصد حکومت وقت کا ابطال تھا اور اس کے لیے ایسے طریقے اختیار کرنے ضروری تھے کہ جو عام فہم ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے اپنے خطبہ میں لوگوں کی عقلوں کو مخاطب کیا لیکن جو باتیں پیش کیں وہ بدہیات اور واضحات میں سے تھیں۔ تاکہ لوگ ایسی مخالفت سے نفرت کریں جو ایسے بے بنیاد اصول پر مبنی ہو۔ چنانچہ پہلے فاطمہ زہرا نے یہ واضح کیا کہ خلیفہ کے فیصلے کی کوئی مسترانی سند نہیں ہے (اس لیے کہ قرآن میں تواریثِ مسلمین کی آیات موجود ہیں)۔

اور اس کے بعد وہ آیات پیش کیں جن میں تواریثِ سلیمان کا ذکر ہے اور پھر ان آیات کا ذکر کیا جن میں میراثِ انبیاء کا ذکر ہے اس کے بعد رنگِ استدلال کو یوں بدل دیا

۲۔ آج کل یہ بات واضحات میں سے ہو چکی ہے کہ خبر واحد مستبر موماتِ شرآن کو تخصیص دے سکتی ہے۔ اس لیے کہ ایسی خبر اصالة العموم یا اصالة الاطلاق پر حاکم یا وارد ہو کرتی ہے۔ کما هو الصحيح۔ لیکن اس کے باوجود فاطمہ زہرا کا امرات سے استدلال کرنا یہ بتاتا ہے کہ آپ ابو بکر کو مستبر نہ سمجھتی تھیں۔

کہ اگر حکیم خلیفہ حق ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ نبیؐ اور وحیؐ سے زیادہ عالم ہے اس لیے کہ انھوں نے اس قسم کی کوئی بات نہیں کی حالانکہ یہ بات واضح ہے کہ ترکہ نبیؐ کا علم ابوبکرؓ کو نبیؐ و علیؓ سے زیادہ کسی صورت سے بھی نہیں ہو سکتا۔ لہذا یہ معلوم ہوا کہ یہ فیصلہ غلط ہے۔

”یا ابن ابی قحافہ! تو اپنے باپ کا وارث ہے اور میں

اپنے باپ کی وارث نہیں؟ یہ تو بہت بڑا بہتان ہے! کیا تو نے

عمدہ کتابِ خدا کو پس پشت ڈال دیا ہے؟ وہ تو کہتا ہے کہ سیدنا

وارثِ دائرہ بنے، اس میں تو ہے کہ ذکر یا نئے بھیجی کی وراثت

کی دعائیہ اور اس کا قانون ہے کہ صاحبانِ قرابت وراثت ہوتے

ہیں۔ کیا تیرے لیے کوئی خاص آیت ہے جس سے میرے باپ کو

الگ رکھا گیا ہے؟ کیا تیرا خیال ہے کہ مختلف الذہب آپس

میں وراثت نہیں ہوتے تو کیا میرا اور میرے باپ کا مذہب ایک

نہیں ہے؟ کیا تو عموم و خصوصِ قرآن کو میرے باپ اور ابن عم

سے بہتر سمجھ لیتا ہے؟“

فاطمہؓ کے اقدام میں سب سے زیادہ نمایاں پہلو جذباتی تھا اور

عجب نہیں کہ فاطمہؓ نے ساری کوشش اسی بات پر صرف کر دی ہو کہ لوگوں کے قلوب و

جذبات کو اپنی طرف موڑ لیں۔ اس لیے کہ قلب ہی حاکمِ نفس اور تہجدِ روحِ انقلاب ہے۔

فاطمہؓ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئیں اور انھوں نے اپنے بیان کو ایسا

رنگ دے دیا کہ احساسات بیدار ہو گئے، جذبات تڑپ اٹھے، دل بے قابو ہو گئے۔ اور

ظاہر ہے کہ ایک عورت کے لیے اس سے بہتر اسکو اور کیا ہو سکتا ہے اگر وہ ایسے وقت

میں قیام کرنا چاہے جس میں فاطمہؓ نے کیا۔

اگر فاطمہؓ کے بیان کا علمی جمال دیکھنا چاہیں تو ہمیں اس خطبہ کی طرف متوجہ

ہونا پڑے گا جو شہزادہ نے مجمع انصار میں منسرمایا تھا۔

منسرماتی ہیں:

”اے گروہ باقی ماندہ مسلمان! اے انصارِ ملت!

اے مریمانِ اسلام! آخر یہ میری نصرت میں کواہی اور میری مدد میں سستی کیوں ہے؟ تم نے میرے حق پر چشم پوشی کیوں کی؟ اور تم میرے ظلم پر سو کیوں گئے؟

کیا رسولؐ نے نہیں فرمایا تھا کہ انسان کا تحفظ اس

کی اولاد سے ہوتا ہے۔ بہت جلدی تم نے باتیں بدل دیں اور

نئی نئی باتیں ایجاد کر لیں، ابھی رسولؐ کا انتقال ہوا ہے اور تم نے دین کو بھی زندہ درگور کر دیا۔ حق یہ ہے کہ انتقالِ رسولؐ

ایک حادثہ عظیم ہے جس سے دین اور ضعیف ہو گیا۔ اس میں

پڑنے والے شگفتہ بہم ہو گئے، کوئی انہیں پُر کرنے والا بھی نہیں۔ زمین

تاریک ہے، پہاڑ مضطرب ہیں اور امیدیں پامال ہو گئیں۔

حریم رسالت کو ضائع اور برباد کیا گیا، ان کی ہتک حرمت

کی گئی۔ یہی مصیبت ہے جس کا قرآن نے اعلان کیا کہ اگر سچیزم

مر جائے یا قتل ہو جائے تو کہیں ایسا نہ ہو کہ تم دین سے پھر

جاؤ اور جو دین سے پلٹ گیا اس سے اللہ کا نقصان نہیں ہے۔“

”کیوں اے بنی قبلہ! تمہارے سامنے میری میراث

ہٹ پ کر لی گئی۔ تم تک خبر نہ پہنچی، تم نے آواز سنی تمہارے

پاس آدمی بھی تھے اور اسلمے بھی۔ تمہیں اللہ نے منتخب کیا تھا

تمہیں اس نے چنا تھا لیکن اس کے باوجود تم نے سامنے

بھی نہ لی۔“

ان بیانات سے ثابت ہو گیا کہ معنی حدیث میں مناقشہ کرنا حکومت وقت کو بے اثر نہیں بنا سکتا تھا۔ اور اس کو اس مقصد سے کوئی علاقہ نہ تھا جسے فاطمہؑ کے اٹلی تھیں اور شاید یہی وجہ ہے کہ آپ نے عطیہ کا بھی تذکرہ اس خطبہ میں نہیں فرمایا۔

خلیفہ کا مقصد کیا ہے؟

جب ہم خلیفہ کی روایات کی وضاحت کر چکے اور یہ ثابت کر چکے کہ ان روایات کی ولایت ان کے مقصد پر واضح نہیں ہے تو اب ضرورت اس بات کی ہے کہ حضرت زہراؑ کے مقابلہ میں ابو بکر کے موقف کی توضیح کرتے ہوئے مسئلہ فدک میں ان کی صحیح رائے معلوم کریں۔ اگرچہ ایک تحقیق کرنے والے کے لیے یہ موقع انتہائی دشوار گزار ہے۔ اس لیے کہ باوجود تاریخی بیانات کی کثرت کے مسئلہ ایک معجز العقول حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے کہ اس مسئلہ میں کوئی مرکز نزاع مبین ہوتا نظر نہیں آتا۔

لوگوں کا خیال ہے کہ مرکز نزاع مسئلہ وراثت انبیاء ہے۔ اس سلسلہ میں صدیقہ مدعی ہیں اور ابو بکر منکر، لیکن میرا عقیدہ یہ ہے کہ اس نقطہ پر مسئلہ پوری طرح حل ہوتا نظر نہیں آتا۔ اور اس طرح پر حسب ذیل امور کا کوئی معقول رشتہ دکھائی نہیں دیتا:

① ————— دورہ ان گفتگو میں خلیفہ نے صدیقہ طاہرہ سے کہا: یہ سال

پنجم کا نہیں تھا، بلکہ مسلمانوں کا سال تھا جس کو پیغمبرؐ بحیثیت امیر صرف کیا کرتے تھے۔ جب ان کا انتقال ہو گیا تو اب اس کا اختیار میرے ہاتھ میں ہے۔ اس کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ محل بحث علاوہ وراثت انبیاء کے کوئی اور شے

دوسری گفتگو کے دوران میں خلیفہ نے کہا: اے فاطمہ تمہارے باپ مجھ سے اور تم میری اولاد سے بہتر ہو لیکن رسولؐ نے فرمایا ہے کہ ہم اپنے ترکہ کا وارث نہیں بناتے یعنی ان مطلوبہ اموال کا اس کلام میں آخری جملہ قابل توجہ ہے۔ اس لیے کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صرف پیغمبر اکرمؐ کی میراث کے لیے ہے نہ کہ جملہ انبیاء کی۔ اور نہ اس کا کوئی تعلق مسلمانوں سے ہے۔ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ خلیفہ کی نظر میں حدیث کا مطلب یہ نہیں تھا کہ (صدقہ میراث نہیں بنتا) اس لیے کہ یہ قانون تمام مسلمانوں کے لیے ہے اور نہ حدیث کا مطلب یہ تھا کہ رسول اکرمؐ کے اموال صدقہ بن جاتے ہیں۔ اس لیے کہ اس کا تعلق تمام اموال سے ہے نہ کہ صرف فاطمہ کے مطلوبہ اموال سے۔ حالانکہ ظاہر حدیث یہ ہے کہ یہ روایت صرف اموالِ فاطمہ زہرا کے بارے میں پیش کی گئی ہے لہذا اب اگر عدم توریث انبیاء کوئی قانونی بات ہے تو اسے جملہ اموال متروکہ میں جاری ہونا چاہیے، صرف اموالِ فاطمہ سے اس کا تعلق خلاف انصاف ہے۔

اس کی مثال یوں ہی ہے کہ اگر کوئی شخص حکم دے کہ آج رات تمام آنے والوں کا احترام کرو۔ اور اتفاقاً اس رات میں دو آدمی آجائیں تو ظاہر ہے کہ مستکلم کی مراد صرف یہ دو آدمی نہیں تھے بلکہ ایک قاعدہ تھا جو ان دو پر منطبق ہو گیا۔ دوسرے نفلوں میں یوں کہا جائے کہ

ترکہ نبیؐ کی تفسیر ان اموالِ خاصہ سے بتائی ہے کہ خلیفہ کے نزدیک یہ حکم انہیں اموال سے مخصوص ہے۔ حالانکہ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ

قانون صرف چند چیزوں سے مخصوص نہیں ہوتا بلکہ جملہ افراد پر حاوی ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ ہم یہ پوچھتے ہیں کہ

اس احسنری جملہ کا فائدہ کیا ہے اور خلیفہ کا اس سے مقصود

کیا ہے؟ اگر حکم عدم وراثت عام ہے تو کیا خلیفہ کو ان اموال پر ترکہ کے صدق میں کوئی شک تھا؟

اگر یہ مان لیا جائے تو اس میں خلیفہ کا فائدہ تو ضرور ہے۔ اس لیے کہ جب ترکہ ہونے میں شک ہوگا تو ورثہ کی طرف منتقل بھی نہ ہوگا۔ لیکن ہم یہ تسلیم نہیں کر سکتے کہ اس جملہ سے خلیفہ اپنا شک رخص کرنا چاہتے ہیں اور فاطمہ زہرا کو باقی اعتراضات سے روکنا چاہتے ہیں۔ اس لیے کہ فاطمہ کا مطالبہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ وہ مال کو ترکہ میں داخل سمجھتی ہیں، ورنہ پھر میراث کیوں بنتا؟

ہاں ہم یہ فرض کیے لیتے ہیں کہ اموال فاطمہ بھی ترکہ کا ایک جزو ہیں اور مراد پیغمبر تمام ترکہ نہیں ہے بلکہ شاید ان کا مقصود فدک جیسی جائیداد ہو تو کیا ہم یہ بھی فرض کر لیں کہ خلیفہ کی غرض اس جملہ سے احکم کا فاطمہ کے اموال سے مخصوص کرنا ہے۔

یہ تو غیر ممکن ہے۔ اس لیے کہ اموال پیغمبر بعض میراث ہوں

اور بعض نہ ہوں، یہ بڑی عجیب و غریب بات ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اس احسنری ٹکڑے سے اگر خلیفہ کا مطلب یہ تھا کہ فاطمہ کو بتادیں کہ تمہارے باپ نے مطلوبہ اموال کو ترکہ قرار دیا ہے تو یہ لغو ہے۔ اس لیے کہ وہ تو ترکہ ہی سمجھ کر میراث میں مطالبہ کر رہی ہیں۔ اور اگر یہ بتانا ہے کہ تمہارے باپ نے بڑے بڑے اموال کو صدقہ قرار دیا ہے تو یہ خود بڑی عجیب سی بات ہے کہ پیغمبر کا کچھ مال تو میراث بن جائے اور کچھ نہ بن سکے۔ جب کہ دیگر روایتیں

عام حکم کا اظہار کرتی ہیں۔

ان تادیبات سے جو بات واضح ہوتی ہے وہ یہ کہ خلیفہ کی نظر میں مفہوم حدیث یہ تھا کہ ہم ان اموال کے مالک ہی نہیں ہیں کہ ان کا کوئی وارث ہو اور اسی لیے آپ نے اسے متروکہ فرمایا ہے۔ جیسے کہ کوئی شخص اپنی اولاد کو جمع کر کے کہے کہ میرا تمام متروکہ صدقہ ہے تو اس کا مقصد یہ ہو گا کہ یہ میری ملکیت نہیں کہ یہ لوگ میرے بعد اس کے وارث ہوں۔

③ — فاطمہ کے نمائندہ کو ابو بکر کا جواب جب اس نے آکر فدک اور خمسِ خیبر وغیرہ کا مطالبہ کیا تو انھوں نے حدیث سنائی۔
 "ہمارے مال کا کوئی وارث نہیں"۔ صرف آل محمدؑ اس میں کھا سکتے ہیں، میں صدقاتِ رسولؐ میں ذرہ برابر تفسیر نہیں دے سکتا۔

اگر ہم یہ فرض بھی کر لیں کہ خلیفہ کی رائے میں حدیث (کا مفہوم یہ ہے کہ انبیاء کے املاک میراث نہیں بنتے) تو بھی ان کے کلام میں تناقض پیدا ہو جائے گا اس لیے کہ اس حدیث سے استدلال یہ بتاتا ہے کہ وہ مطالباتِ زہرا کو اموالِ نبوی نہیں جانتے ہیں، لیکن اس کی میراث کے قائل نہیں ہیں اور جلد آخر اس کے بالکل برعکس ہے۔ اس لیے کہ جس مال میں فاطمہ زہرا و دشمنِ پیغمبر کو (بقول ابو بکر) بدلنا چاہتی تھیں وہ فدک و خمسِ خیبر وغیرہ ہے۔ جن کو انھوں نے پہلے سوال میں شمار کیا ہے اور اب صدقاتِ نبویؐ سے تعبیر کر رہے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ اموال نہیں ہیں بلکہ صدقات ہیں۔

اور یہ ایک متضاد منطوق ہے۔

خلیفہ سے تصفیہ کا حساب

بعض روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ابو بکر کسی بھی نبی کی وراثت کے قائل نہ تھے۔ اس لیے کہ جس روایت نے خطبہ زہرا کو نقل کیا ہے اور یہ بیان کیا ہے کہ ابو بکر نے "انما معاشر الانبیاء" سے استدلال کیا ہے۔ اس میں یہ بھی ہے کہ فاطمہ نے میراث کی عام و خاص تمام آیات سے اعتراض کیا لیکن ابو بکر عدم تواریث نبی پر اڑے رہے اور روایت کو بزور بیان کرتے رہے۔ فاطمہ بھی اسی شدت سے انکار کرتی رہیں۔

اب خلیفہ کی دو حدیثیں ہو گئیں:

① ————— صدقات میراث نہیں بنتے۔

② ————— انبیاء کا کوئی وارث نہیں ہوتا۔

اور اس سے ان کے دو دعوے بنے:

① ————— فدک صدقہ ہے لہذا میراث نہیں بن سکتا۔

② ————— املاک نبی میراث نہیں بنتے۔

پہلی حدیث میں آخری جملہ کا اضافہ کر کے فدک کو صدقہ بنایا اور دوسری

حدیث سے اس کا میراث ہونا ختم کر دیا۔

ان بیانات کے بعد اگر ہم خلیفہ سے تصفیہ کا حساب کرنا چاہیں تو اس

میں ذرا بھی وقت نہ ہوگی۔ اس لیے کہ موقف بالکل واضح ہو گیا ہے اور حدیث

کے سارے احتمالات سامنے آچکے ہیں۔

ہمارے اب تک کے اعتراضات کا خلاصہ حسب ذیل امور

میں واضح ہو جاتا ہے:

① — خلیفہ نے اکثر اوقات میں خود اپنی حدیث کی مخالفت کی جیسا کہ ابتدائے بحث میں بیان کیا گیا۔

② — یہ احتمال بے جا ہے کہ رسولؐ نے اپنی دختر سے حدیث کو مخفی رکھا اور اسے ابوبکر سے بیان کر دیا۔ حالانکہ ابوبکر عمارت رسولؐ کے ساتھ تنہا نہ رہتے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ رسولؐ نے عمداً تنہائی میں بلا کر انھیں حدیث بتادی اور فاطمہؓ سے چھپا لیا تاکہ بھرے دربار میں یہ جملہ دشمنانہ ہوں (نعوذ باللہ)۔

③ — علیؓ بلا شک و شبہ اوصیٰ رسول اکرمؐ ہیں جیسا کہ حدیث متواتر میں وارد ہوا ہے کہ جو کتب روایت سے گزر کر شعرا کے دوایت تک پہنچ گئی اور جس کو حسب ذیل حضرات نے نظم بھی کر دیا :
عبداللہ ابن عباس، خزیمہ بن ثابت، حجر بن عدی، ابی سلمہ بن تیہان، عبداللہ بن ابوسفیان بن حریث بن عبدالمطلب، حسان بن ثابت، امیر المؤمنین علیؓ ابن ابیطالبؓ، بنا بریں وصایت وہ منصبِ اسلامی ہے کہ جو علیؓ کی ذات کے ساتھ بلا شک و شبہ مخصوص ہے (اگرچہ اس وصایت میں شیعہ و سنی میں اختلاف ہے شیعہ کا خیال ہے کہ وصایت بمعنی نص رسولؐ ہے اور سنی

یہاں تک کہ عائشہ بیان کرتی ہیں کہ جب بعد وفات رسول کریمؐ میراث میں خلیفان ہوا تو کسی کے پاس کوئی علم نہ تھا۔ اس کار ابا جان نے یہ روایت بیان کر دی کہ انبیاء لا وارث ہوتے ہیں۔ (ملاحظہ ہو صواعق محرقة - ابن حجر عسقلانی)

۴۷ شرح نہج البلاغہ ج ۱ ص ۴۷-۴۹ ج ۳ ص ۱۵

۴۸ شرح نہج البلاغہ ج ۱ ص ۴۷

کا خیال ہے کہ وصایت بمعنی وراثت علم و شریعت وغیرہ ہے (میں اس وقت اس بحث کو نہیں چھیڑنا چاہتا۔ صرف جس قدر میرے موضوع سے متعلق ہے اسی قدر بیان کرنا چاہتا ہوں اور اگر ہم یہ فرض کر لیں کہ وصایت بمعنی خلافت ہے تو پھر کہنا پڑے گا کہ صدیق نے اسلامی اقدار میں بہترین اشیاء کی چوری کی اور امور امت میں بلاوجہ شرعی تصرف کیا اور ایسے شخص کو حکومت کا کوئی حق نہیں ہے اور نہ اس کی کوئی حدیث مستحب ہے۔

اور اگر یہ مان لیں کہ وصایت بمعنی وراثت علم و شریعت ہے تو کیا ممکن ہے کہ اس وصایت کو ماننے ہوئے اس حدیث کو کبھی مان لیں جس کا وصی انکار کرے۔ حالانکہ شریعت ساویہ کے لیے بیدار مغزی ہی ایک انسان ہے جس کی رائے ہر ایک مسئلہ میں جلاتر و قبول کرنی چاہیے۔ یہ امین رسول اور اعلم شریعت پیغمبر ہے۔

اگر یہ احتمال دیں کہ وصایت سے مراد وراثت مخصوصات رسالت ہے تو پھر اس کا کیا مطلب ہے کہ وراثت رسول کے ہوتے ہوئے ترک رسول کو غیروں کے ہاتھ میں نہ لے کر کہ نبوت پر بلاوجہ شرعی کے قابض ہو جانا یہ خلیفہ کے اولیات (۴) ————
ہیں سے ہے۔ اس سے قبل تاریخ میں اس قسم کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ حالانکہ اگر یہ قاعدہ وراثت انبیاء کے متعلق ہوتا تو ہر خلیفہ کا کردار اس کے نبی کے متروکات کے متعلق ایسا ہی ہوتا جس طرح کہ یہاں تھا۔

ملکیت فدک سے انکار کر دینا جیسا کہ بعض کلمات سے ظاہر ہوتا ہے۔ انتہائی جلد بازی کی دلیل ہے۔ اس لیے کہ یہ ایک

لے اولیات تاریخ میں ان تمام باتوں کو کہتے ہیں کہ جن کو صاحب مجالہ سے پہلے کسی اور نے زایجاو کیا ہو۔ مترجم

تاریخی حقیقت ہے کہ مذکورہ بلا کسی حرب و ضرب کے حاصل ہوا ہے اور ہر وہ خطہ جو بغیر جنگ کے حاصل ہو خاص پیغمبر کی ملکیت ہوتا ہے۔ جیسا کہ آیات قرآنی سے معلوم ہوتا ہے۔ پھر اس قسم کی کوئی بھی حدیث نہیں ہے کہ پیغمبر نے اسے تصدق یا وقف کر دیا ہو۔

⑤ — وہ دونوں حدیثیں جو خلیفہ نے اس موضوع میں پیش کی ہیں قطعاً ان کے مطلوب کے لیے وافی نہیں ہیں۔ بلکہ ان کے معانی کچھ اور ہیں جن کی وضاحت کی گئی۔ اگر کوئی شخص ہمارے معنی کو معین طور پر تسلیم نہ کرے تو کم از کم اتنا تو ضرور مانے گا کہ تمام مسانی برابر ہیں اور اس صورت میں کلام محفل ہو جاتا ہے اور یہ قاعدہ ہے کہ محفل کلام سے استدلال انتہائی مہل ہوتا ہے۔

ان اعتراضات کے بعد ہم ایک اعتراض اور کر سکتے ہیں۔ اس فرض پر جب ہم خلیفہ کے بیان کردہ مسانی کو تسلیم کر لیں اور کہیں کہ "انا معشر الانبیاء لا نورث" سے مراد قانون عدم وراثت ہے اور نہ اس ترکنا لا صدقۃ سے مراد مستقل جلد ہے کہ ہمارے متروکات صدقہ بن جاتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ہم یہ کہیں گے کہ اس روایت کی تاویل انتہائی ضروری ہے اور اس کے ظاہر پر اعتماد اصطلاح علمی کے لحاظ سے ناجائز ہے اور وہ اس لیے کہ روایت کا مطلب جمیع انبیاء کا لاوارث ہونا ہوگا۔ جیسا کہ بعض احادیث میں صراحتاً بیان ہوا ہے اور "لا نورث" میں صبیحہ جمع بھی اسی بات پر دال ہے۔ اس لیے کہ حکم جماعت کے لیے ہے اور ظاہر ہے کہ ایسی کوئی جماعت عامۃ المسلمین میں نہیں ہے کہ جس کی خصوصیات میں عدم تورث بھی

داخل ہو۔ حالانکہ عدم تواریث جمیع انبیاء صریح قرآن کے مخالف ہے۔ جس میں مختلف انبیاء مثل زکریا، سلیمان وغیرہ کی وراثت کا ذکر ہے اور ظاہر ہے کہ اس وراثت سے بھی مراد وراثت مال ہے (اس لیے کہ وہی اس قابل ہے کہ ورثہ کی طرف منتقل ہو سکے) علم و شریعت حقیقتاً قابل انتقال نہیں ہیں۔ (اس لیے کہ علم بنا بر قول بہ اتحاد عاقل و معقول غیر ممکن انتقال ہے بلا شک و ریب)

اور اسی طرح اگر ہم عاقل و معقول میں وجود کے اعتبار سے مغایرت بھی تسلیم کریں جب بھی اتنا ضرور کہیں گے کہ صورت علمیہ مجرد ہوتی ہے اور وہ نفس انسانی کے ساتھ قائم ہیں یعنی معلول نفس ہیں اور ظاہر ہے کہ ہر معلول بحیثیت ذات اپنی علت سے وابستہ ہوتا ہے۔ لہذا اس کا ایک علت کو چھوڑ کر دوسری کی طرف منتقل ہو جانا نسبتاً ہی غیر معقول ہے۔

اور اگر ہم اس امر کے قائل ہو جائیں کہ صورت علمیہ معلول نفس نہیں ہے بلکہ نفس انسانی میں حلول کیے ہوئے ہے اور اس کی علت کوئی اور شے ہے، جب بھی یہ واضح امر ہے کہ ایک حلول کرنے والی شے کبھی اپنا محل تبدیل نہیں کر سکتی۔ جیسا کہ فلسفہ میں ثابت ہو چکا ہے۔ اس صورت میں خواہ ہم صورت علمیہ کو مجرد مابین یا مادی کوئی فرق نہ ہوگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تحقیق ناسفی کے اعتبار سے علم کسی صورت سے قابل نقل و انتقال نہیں ہے۔

اسی طرح نبوت بھی عقلی اعتبار سے قابل نقل و انتقال نہیں ہے خواہ ہم نبوت کی وہ تفسیر کریں کہ جو بعض فلاسفہ نے کی ہے۔ یعنی نبوت کمال نفس کا ایک رتبہ اور فضل انسانی کا ایک آخری درجہ ہے جہاں ارتقائے انسانیت اور کمال بشریت کی حد بندی ہو جاتی ہے یا وہ معنی بیان کریں جو ازہان عامہ مسلمین میں ہیں۔ یعنی

لے تو سین کے درمیان کی عبارت اگر ترک بھی کر دی جائے تو مطالبہ میں کوئی خلل واقع نہ ہوگا۔ مترجم

یہ کہ نبوت ایک منصب الہی ہے جس کو وہ "جلی" کرتا ہے کمالِ نفس صرف شرائطِ نبوت میں ہے وہ عینِ نبوت نہیں ہے۔

واضح ہے کہ پہلے معنی کے اعتبار سے نبوت قابلِ نقل و انتقال نہیں ہے۔ اس لیے کہ نبوت نفس و وجودِ تجلی اور عینِ کمالِ ذاتی پیغمبر ہے۔ اسی طرح دوسرے معنی کے لحاظ سے، اس لیے کہ اس بنا پر نبوت ایک ربانی اعتبار ہے جو کسی خاص شخص سے قائم ہوتا ہے۔ اس کا انتقال بغیر تبدیلی شخص کے ناممکن ہے اور تبدیلی شخص ایک نئے اعتبار کو مستلزم ہے جس سے کہ نئی نبوت بن جائے گی۔ مثلاً نبوت زکریاؑ۔ یہ مختصاتِ نفس زکریاؑ میں سے ہے۔ وہ کسی اور طرف منتقل ہو جائے یہ ناممکن ہے۔ اگر اللہ کسی اور کو بھی نبی فرما کرے گا تو یہ جدید نبوت ہوگی نہ کہ منتقلی نبوت۔

یہ امر تو بادی النظر میں بھی واضح ہو جاتا ہے کہ نبوت اور علم قابلِ انتقال نہیں ہیں۔ یہ کوئی ایسی عمیق و دقیق بات نہیں ہے کہ خلیفہ کی سمجھ میں نہ آسکے اور جب یہ معلوم ہو گیا کہ یہ چیزیں قابلِ توارث و انتقال نہیں ہیں تو مراد صرف وراثتِ مال ہے۔ اور اس حالت میں آیت، روایتِ خلیفہ سے معارضت ہو جائے گی لہذا کم از کم روایت کی تاویل تو کرنا ہی پڑے گی۔

✽ ————— جناب زکریاؑ کے قصہ میں وراثتِ مال پر ایک اعتراض یہ کیا جاتا

ہے کہ اس صورت میں دعائے نبی غیر مستجاب ہو جاتی ہے اس لیے کہ جناب یحییٰ واریثِ مال نہیں ہوئے چونکہ زکریاؑ کی زندگی میں شہید ہو گئے۔ البتہ وراثتِ نبوت ضرور ہوئے اس لیے کہ نبی ہوئے لیکن اس کا حل یہ ہے کہ اعتراض ہر حال میں باقی ہے اگر وراثتِ نبوت کے قائل ہوں تو بھی دعا غیر مستجاب ہوگی اس لیے کہ دعا اس وراثت کے لیے ہے جو بعد زکریاؑ حاصل ہو اور یہ نبوتِ یحییٰ

حیاتِ ذکر یا میں تھی۔ لہذا ضرورت اس بات کی ہے کہ آیت کی ایسی تفسیح کی جائے جس سے یہ امر امن بالکل ختم ہو جائے اور وہ یہ کہ جملہ "تیر شنی ویرت من ال یعقوب" کو دعائے مقدر کا جواب قرار دیا جائے اور مطلوب ذکر یا صرف فرزند ہو جس کا مطلب یہ ہوگا کہ مجھے فرزند دے۔ اگر فرزند ہوگا تو وہ وارث بھی ہوگا۔ اس جملہ کو ولی کی صفت نہ قرار دیا جائے کہ جس کا مطلب یہ ہے کہ خدایا ایسا فرزند دے جو وارث بھی ہو۔

بنا بریں مسئلہ وراثت دعائے ذکر یا سے جداگانہ ہے۔ یہ صرف ذکر یا کا اعتقاد ہے کہ اگر لڑکا ہوگا تو وہ وارث بھی ہوگا۔ اعراب کے اعتبار سے دونوں سمانی میں فرق ہوگا۔ اگر جملہ کو صفت قرار دیا جائے تو وہ مرفوع ہوگا تیر شنی" اور اگر جواب دعائے مقدر قرار دیا جائے تو مجددوم ہوگا "تیر شنی" چنانچہ اس لفظ کی قرأت میں دو وجہیں نقل کی گئی ہیں۔

اگر ہم تترآن میں دوسرے مقام پر دعائے ذکر یا کو دیکھتے ہیں تو وہاں بھی دعائے ذریت طیبہ سے متعلق نظر آتی ہے: "ھب لی من لدنک ذریۃ طیبۃ"

فہم تترآن کا سب سے بڑا ذریعہ خود قرآن مجید ہے اور ان آیات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ذکر یا کا مطلب صرف ذریت طیبہ ہے۔ البتہ کبھی اس کو ایک جملہ میں بیان کر دیا ہے جیسا کہ اس آیت میں ہے اور کبھی دو جملوں میں جیسا کہ آیت سابقہ میں ہے۔ پہلے ولی کی دعا ہے۔ پھر تمنا ہے کہ وہ پسندیدہ بھی ہو۔

بہر حال دونوں مقامات کو ملانے کے بعد یہ حاصل ہوتا ہے کہ
وراثت کا مسئلہ حدود و دعا سے خارج ہے لہذا اس کو دعائے مقدمہ
کا جواب ماننا پڑے گا۔

اب یہ امر واضح ہو گیا کہ کلمہ ارث کا استعمال بالکل صحیح ہوا ہے
اور مراد آیت وراثت مال ہے نہ کہ ارث نبوت۔ اس لیے کہ
حقیقتاً وراثت مال ہی وہ شے ہے کہ جو جواب واقع ہو سکتی
ہے۔ اس لیے کہ جو اس دعا وہ شے ہوا کرتی ہے کہ جس کو اصل
دعا سے دائمی یا کم از کم اکثری ارتباط ہو اور ظاہر ہے کہ نبوت
ایسی شے نہیں ہے۔ دنیا میں لاکھوں اولاد پیدا ہوتی ہے لیکن
نبی کوئی نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ بیش کمالِ عظیم اور جمالِ کامل کی
طالب ہے۔ ایسی نبوت کو سوالِ ذریت طیبہ کا جواب نہیں
قرار دیا جاسکتا۔ اس لیے کہ ذریتِ انسانی اور قابلِ تخلُّکِ کرانی
نبوت میں نسبتاً ایک اور لاکھ کی ہے۔ برخلاف وراثت مال
کے کہ وہ جواب دعا بن سکتی ہے۔ اس لیے کہ لڑکا جب باپ
کے بعد باقی رہتا ہے تو اکثر وراثت بھی ہوتا ہے۔ اب چونکہ یہ
ایک اکثری امر ہے لہذا اس کا اعتقاد ذکر یا کو بھی ہو سکتا
ہے۔ اس کے علاوہ یہ کہ خود حضرت زکریاؑ بھی نبوت کو لازمہ
ذریت نہیں جانتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اولاد کی
دعا کے بعد یہ دعا بھی کی کہ بارِ الہا! اس اولاد کو نیک اور پسندیدہ
بھی قرار دے۔ ظاہر ہے کہ نبوت کے بعد اس دعا کا کوئی عمل
باقی نہیں رہتا۔

اگر ہم کلمہ سیرتِ نبوی کو صفتِ دل بھی تسلط دےں تو یہ بھی ہمارا خیال ہے کہ نتیجہ وہی رہے گا۔ اور مراد وراثتِ مال ہی ہوگی۔ اس سلسلے میں دو باتیں ہماری سوید ہوں گی :

① — اگر جنابِ زکریا کا مطلب وہ ولی ہوتا جو وارثِ نبوت بھی ہو تو وہ دعائے پسندیدگی نہ فرماتے۔ اس لیے کہ نبوت پسندیدگی سے کہیں عظیم منزل ہے۔

② — سورہ آل عمران میں جنابِ زکریا کے قصہ میں ارث کا مطلق ذکر نہ ہونا یہ بتاتا ہے کہ اگر میراثِ حدود دعا سے خارج نہیں تو کم از کم میراث سے مراد ارثِ مال ضرور ہے۔ اس لیے کہ اگر زکریا کی دعائیں دو ہوتیں، ایک پسندیدہ دل کی اور دوسری وراثتِ نبوت کی تو قرآن مجید، آل عمران میں صرف ایک دعا پر اکتفا نہ کرتا۔

اگر اس امر کی وضاحت درکار ہے تو یوں تصور نہ فرمائیں کہ اگر کوئی سائل آپ سے ایک باغ اور ایک درہم طلب کرے اور آپ دونوں اسے دے دیں اور پھر قصہ کو نقل کریں اور اپنے فضل و کرم کا اظہار کریں تو کیا ممکن ہے کہ ایک درہم کا ذکر کریں اور باغ کا ذکر چھوڑ دیں۔ حاشا دکلا! ہمیشہ بڑی شے کا ذکر کیا جاتا ہے۔

جب عام اعلانات و احسانات کا یہ قانون ہے تو عطا و شہرت جو کہ باغ و تیوی سے لاکھوں درجہ اہم ہے، کیا ممکن ہے کہ ذریت کے مقابلے میں اس کا ذکر بالکل ترک کر دیا جائے؟

ان وجوہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مراد وراثتِ مال ہے۔ اس لیے کہ ذریتِ طیبہ سے لپٹ ہے۔ اب اگر اس کا تذکرہ کسی مقام پر بھی نہ ہو تو کوئی حرج نہیں ہے۔

④ — بعض علماء نے آیت میں میراث نبوت مراد لینے کی دو وجوہات
تفسیر فرمائی ہیں:

① — جناب زکریاؑ نے اپنی وراثت کے ساتھ آل یعقوبؑ کی وراثت
کا بھی ذکر کیا ہے اور ظاہر ہے کہ حضرت سحیٰؑ تمام اموال آل یعقوبؑ
کے وارث نہیں تھے۔ البتہ نبوت و مملکت کے وارث ضرور تھے۔

② — جناب زکریاؑ نے بطور تمہید کہا تھا۔ "خدا یا! مجھے اپنے بعد کے
لیے اپنے اہل عیال سے خطرہ ہے" اور ظاہر ہے نبی کو خطرہ احکام
دین اور آثار شرعیہ کے بارے میں ہوگا جس کی بقا مطلوب
رسالت ہے نہ کہ اموال دنیوی کا کہ جو مقام نبوت سے کہیں
زیادہ پست ہے۔

ہمارے علماء نے پہلی دلیل کا جواب یہ دیا ہے کہ
جناب زکریاؑ نے تمام آل یعقوبؑ کی وراثت کی دعا نہیں کی،
بلکہ بعض کی جیسا کہ آیت میں مذکور ہے۔ "و یؤت من آل یعقوب" اور یہ
دعا قبول بھی ہوگئی۔ لہذا یہ اعتراض לנו ہے۔

وہ گئی دوسری دلیل تو وہ ہمارے مطلوب کی شاہد ہے۔ اس لیے کہ نبوت
کے بارے میں خطرہ کا کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ جبکہ یہ طے شدہ امر ہے کہ لطف خداوند کا
انسان کو بلا کسی حجت و دلیل کے حیران و سرگرداں نہیں چھوڑ سکتا۔ وہ ہر دور میں کوئی
نہ کوئی نبی بنا رہے گا اور ہر عہد میں صاحب استمقان کو یہ عہدہ دیتا رہے گا۔ اس کے
لئے اور برباد ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں ہے۔

تو پھر کیا دعائے زکریاؑ کا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے یہ احتمال دیا تھا کہ اللہ

نے کلام عرب میں لفظ "من" بعض کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہوں کتبہ علم نحو (مترجم)

ابنا عم میں سے ان لوگوں کو منصب دے دیا کہ جو واجبات رسالت اور قرآن نبوت کو نہ ادا کر سکیں۔ یا یہ خیال تھا کہ میری دعا کے بغیر اللہ بندوں کو بلا حاجت و دلیل چھوڑ دے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ باتیں شان نبوت سے بعید ہیں۔

بنا بر این مراد صرف خوف اموال ہے۔ اس لیے انھوں نے "ولد رضی طیب" کا مطالبہ کیا تھا۔ اور اس دعا میں نبی کے لیے کوئی نقص نہیں ہے اس لیے کہ ممکن ہے ان کا مطلوب یہ رہا ہو کہ یہ مال ابھی اولاد کو ملے تاکہ معرفت اچھا ہو، ورنہ اگر ابنا عم کو مل گیا تو وہ لہو و لعاب، فتنہ و فساد میں صرف کر دیں گے، جیسا کہ آثار سے انھوں نے اندازہ کر لیا تھا۔ یہاں تک کہ مشہور ہے کہ جناب زکریاؑ کے ابنا عم اشرار بنی اسرائیل تھے۔

ابن ابی الحدید معتزلی نے کوشش کی ہے کہ جناب زکریاؑ کے خوف کو آثار دین سے متعلق قرار دیں اور اس پر دو قسم کی دلیلیں قائم کی ہیں۔

① — یہ دعویٰ کرنا کہ آثار دین کا خوف کرنا نبی کے لیے ناجائز ہے اصول شیعہ کی بنا پر قطعی غلط ہے۔ اس لیے کہ یہ لوگ قائل ہیں کہ ہم غیبت امام کی بنا پر اکثر الطاف الہیہ سے محروم ہو گئے ہیں جیسے نماز عید جمعہ وغیرہ اور اس کا مظلمہ ہماری ہی گردن پر ہے۔ اس لیے کہ ہماری بد کرداریاں ہی اس کا سبب ہوئی ہیں۔ تو کیا ایسی قوم کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ جناب زکریاؑ کے لیے بھی یہ تصور کرے کہ وہ تبدیلی دین اور بربادی احکام شریعت سے خائف رہے ہوں گے اس لیے کہ اللہ پر بے پشت رسول واجب ہے، اگر لوگ خود فساد برپا کریں اور دین میں تبدیلی لائیں تو خدا پر واجب نہیں کہ ان کے درمیان دین کو محفوظ رکھے۔ کیونکہ انھوں نے خود لطف الہی

کو مسترد کیا ہے۔ خلاصہ یہ کہ انبائے عم کے فساد سے سد بابِ لطف کا احتمال تھا اس لیے جناب زکریاؑ کو بھی خوف پیدا ہوا۔

ہمارا اعتراض اس کلام پر صرف یہ ہے کہ

اس مقام پر ابن ابی الحدید نے دو مطالب کو باہم مخلوط کر دیا ہے ایک وہ موقع ہوتا ہے کہ جب لوگ اس طرح نااہل ہو جائیں کہ لطفِ الہی کا استحقاق ختم ہو جائے جیسا کہ زمانِ غیبتِ امام میں ہے۔ اس صورت میں خوف پیدا ہو سکتا ہے۔ لیکن ایک موقع وہ ہوتا ہے کہ جہاں انسان یہ جانتا ہے کہ ایک جماعت منصبِ الہی کے حصول کی لیاقت نہیں رکھتی، حالانکہ لوگ لطف و کرمِ الہی کے مستحق ہیں۔

ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں بعثتِ رسول، خداوندِ عالم پر واجب ہے لہذا اب خوف کا کوئی محل نہیں رہتا۔ بنا براین انبائے عم کا نااہل ہونا اس امر کا باعث نہیں ہو سکتا کہ زکریاؑ کو انقطاعِ سلسلہ نبوت کا خوف پیدا ہو جائے۔ جبکہ لوگ بھی الطمانِ الہیہ کے مستحق ہیں۔ ہاں اگر لوگ مستحقِ لطف نہ رہیں تو ممکن ہے کہ زمین و آسمان کے اتصالی سلسلے قطع ہو جائیں، خواہ اولاد و انبائے عم صالح ہوں یا فاسد۔ ذریتِ طیب ہو یا غیر طیب، آیتِ صراحتاً دلالت کرتی ہے کہ زکریاؑ کا خوف انبائے عم کی خرابی سے تھا نہ کہ لوگوں کی نااہلی سے۔ بنا براین خوفِ انقطاعِ نبوت سے متعلق نہیں ہو سکتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ خوفِ بربادیٰ اسواں سے متعلق تھا۔

ہم سوالی کے معنی امر اور رؤسار کے قرار دیں گے اور مقصد یہ ہو گا کہ جناب خائف تھے کہ میں ایسا نہ ہو کہ یہ امر اور رؤسا مسلط ہو کر دین کو فاسد کر دیں۔ اسی لیے دعا کی کہ اللہ ایک نبی بنا دے تاکہ دین محفوظ رہ سکے۔

ہم سوال کریں گے کہ یہ رؤسا کہ جن سے دین میں خطرہ تھا، انبیاء تھے یا غیر انبیاء؟

ظاہر ہے کہ انبیاء سے دین کے لیے کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا، اس لیے کہ وہ معصوم ہوتے ہیں۔ البتہ ملوک دنیا سے کبھی کبھی دین کو خطرہ ہو جاتا ہے۔

لیکن اس وقت ہمیں یہ دیکھنا پڑے گا کہ وجود نبی آیا ان کے شر و فساد اور توہین دستور الہی کو روک سکتا ہے یا نہیں۔ اگر وجود نبی ان کے دفاع کے لیے کافی ہے تو زکریاؑ کو خوف کی کیا ضرورت ہے؟ جب کہ وہ جانتے ہیں کہ اللطاف الہیہ بعثت نبی کے قیامت تک کے لیے ضامن ہیں اور یہ اتصال زمین و آسمان تا بقائے دنیا باقی رہے گا۔

اور اگر وجود نبی دفاع اشہر کے لیے کافی نہیں ہے تو زکریاؑ کی دعا بے سود ہے۔ اس لیے کہ اولاد کا وجود بھی ان کے خوف کو زائل نہیں کر سکتا۔ حالانکہ ظاہر آیت یہ ہے کہ مطلوب نظر و ارث کے ملنے کے بعد ان کا خوف دور ہو جائے گا۔

اس قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مراد قرآن ارث مال ہے نہ کہ تزکیر نبوت۔ اور جب یہ ثابت ہو گیا کہ انبیاء میں سلسلہ توارث ہے تو اب خلیفہ کی حدیث قرآن سے معارض ہو گئی اور ہر وہ شے جو قرآن سے معارض ہو وہ ساقط اور باطل ہے۔

ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ تمام انبیاء میں سے زکریاؑ کو مستثنیٰ کر دیں اس لیے کہ حدیث خلیفہ قابل تخصیص نہیں ہے۔ لہذا اگر نبوت عدم توارث کی مقتضی ہے تو ہر نبی

سے اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ بعض روایات اس قسم کی ہوتی ہیں کہ ان میں تخصیص ظہیر ممکن ہوتی ہے اگرچہ

اس کا کوئی قانون کلی مقرر نہیں ہے۔ لیکن روایت کے الفاظ خود اپنی حیثیت کو واضح کرتے ہیں جیسے کہ معصوم

کا یہ ارشاد کہ کتابہ خدا سے معارض حدیث باطل اور قابل عمل نہیں ہے۔ اب اگر کسی روای کی معارض حدیث کو

مستثنیٰ کرنا چاہیں تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ باطل حدیث پر کبھی بعض حالات میں عمل ہو سکتا ہے اور ظاہر ہے کہ

یہ امر خود باطل ہے۔ بعینہ یہی معاملہ اس مقام پر ہے اس لیے کہ حدیث خلیفہ میں انبیاء کی عظمت کی بنا پر وراثت کی نفی

لاگنی ہے۔ اب اگر کسی نبی کے یہاں وراثت کے قابل ہو جائیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی عظمت انکار کریں اور اعمال سے

کی شان بھی ہونی چاہیے۔ نبوت زکریا میں ایسی کوئی خصوصیت نہیں ہے کہ وہاں تواریخ ہو اور باقی کے یہاں نہ ہو۔ آخر زکریا کا کیا قصور ہے کہ ان کا مال امت کو ملے اولاد لے جائے؟ یا ان کا کیا امتیاز ہے کہ ان کا مال تو اولاد کو ملے اور باقی کا مال لوگ لوٹ کھائیں؟ اس کے علاوہ حدیث خلیفہ میں لفظ انبیاء میں کوئی تخصیص کی ضرورت بھی نہیں ہے جب کہ ہم نے اس کے ایسے مناسب معنی بیان کر دیے کہ جو قرآن سے قطعاً معارض نہیں ہیں۔ اب ہمیں کیا ضرورت ہے کہ ہم ایسے معنی قرار دیں کہ جس کی وجہ سے زکریا کو فہرست انبیاء سے خارج کرنا پڑے۔

اب واضح ہو گیا کہ خلیفہ کے مفہوم کی بنا پر روایت آیت سے بالکل معارض ہے لہذا اسے ترک کرنا واجب ہو گا اور شاید یہی وجہ ہے کہ جب صدیقہ طاہرہ نے آیت مذکورہ سے خلیفہ پر اعتراض کیا تو انھیں کوئی جواب بن نہ پڑا اور تہ آج تک ان کے ماننے والوں نے اس کا کوئی جواب دیا۔ جس کی واحد وجہ یہ ہے کہ وہ لوگ جانتے ہیں کہ آیت سے روایت کا تعارض ہو رہا ہے اور روایت کسی صورت سے قابل عمل نہیں ہو سکتی۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ علی القاعدہ جب دو دلیلوں میں تعارض ہو تو ایک کو مقدم کر سکتے ہیں۔ اور خلیفہ نے حدیث کو مقدم کر دیا اور کیوں کہ قرآن سے متعارض حدیث باطل و خرافات ہے اس لیے اسے دلیل ہی نہیں کہتے۔

خلیفہ کی جرح دوسرے مرکز پر

(مقام ثانی - موقف خلیفہ در موضوع عطیہ):

صدیقہ طاہرہ مدعی ہیں کہ رسول نے انھیں فدک عطیہ کر دیا تھا اور اس کے شاہد ام ایمن، علی ابن ابی طالب اور حسنین ہیں۔ خلیفہ نے دعویٰ کو قبول نہیں کیا اور بیبہ کاملہ یعنی دو مرد یا ایک مرد اور دو عورت کا مطالبہ کیا۔

سب سے پہلا مواخذہ صدیق سے یہ ہو گا کہ وہ اس مسئلہ میں حاکم کیونکر بن گئے۔ حالانکہ کم از کم اس وقت تک ان کی حکومت شرعی نہ تھی۔ ہم فی الحال اس مواخذہ کو ترک کیے دیتے ہیں۔ اس لیے کہ یہ موضوع انتہائی وسیع ہے جس کے نتیجہ میں اسلامی سیاست کا سنگ بنیاد ہی اکھڑ جائے گا اور اس کام کے لیے حسابِ طویل درکار ہے۔

دوسرا مواخذہ یہ ہے کہ جب فدک فاطمہؑ کے قبضہ میں تھا تو اب انھیں گواہ پیش کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس مقام پر دو بحثیں ہیں:

① — فدک کس کے قبضہ میں تھا؟ کیا فدک واقفانہ فاطمہؑ کے ہاتھ میں تھا؟

اس مطلب کا بہترین ثبوت امیر المؤمنینؑ کا وہ خط ہے جو آپ نے عثمان بن حنیف کے نام تحریر فرمایا تھا:

"ہاں! فدک ہمارے ہاتھ میں تھا۔ اس کے بعد ایک قوم نے اس کی طبع کی اور دوسری نے ان کو دے دیا۔"

اس کلمہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فدک اہلبیت کے ہاتھ میں تھا جیسا کہ روایاتِ شیعہ میں بھی ہے۔ آپ کا یہ فرمانا کہ "ہمارے ہاتھ میں فدک تھا۔" اس سے واضح ہوتا ہے کہ مراد صرف علیؑ و فاطمہؑ کا ہاتھ ہے نہ کہ وصیتِ پیغمبرؐ۔ اس لیے کہ پیغمبرؐ کے ہاتھ میں غیر فدک اور اموال بھی تھے اور آپ نے فرمایا ہے کہ ہمارے ہاتھ میں فدک تھا۔

② — کیا قبضہ دلیل ملکیت ہے؟ اس کا ثبوت اجماعِ مسلمین ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو نظامِ اجتماعی حیاتِ انسانی مختل ہو کر رہ جاتا۔ بعض لوگ اس دعویٰ پر کہ فدک فاطمہؑ کے قبضہ میں تھا یہ اعتراض کرتے

ہیں کہ اگر ایسا ہوتا تو آپ ذکر کرتیں اور اس وقت نہ دعویٰ عطیہ کی ضرورت پڑتی اور نہ میراث کی۔

کتب شیعہ میں اس کا جواب موجود ہے کہ اہل بیت نے اس بات سے بھی استدلال کیا ہے۔ لیکن ہم ان کتابوں سے بحث کرنا نہیں چاہتے بلکہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ فدک کو فی مہولی زمین یا چھوٹی ملکیت نہیں کہ جس کا قبضہ اولیٰ توجہ سے معلوم ہو جائے بلکہ یہ ایک وسیع اراضی ہے جس میں فاطمہؑ کا وکیل انتظام کرتا تھا۔ تو اب بتلائیے کہ اس کے قبضہ کا علم غیر وکیل کو کیا ہو سکتا ہے؟

یہ بھی معلوم ہے کہ فدک مدینہ سے قریب بھی نہ تھا کہ اہل مدینہ کو اس کے حالات کا علم ہو جائے اور وہ یہ جان لیں کہ اس کا متولی کون ہے۔ بلکہ مدینہ سے چند دنوں کے راستے پر تھا اور ایک یہودی قریہ تھا جس کو محیطہ اسلامی سے کوئی تعلق بھی نہ تھا بنا برائے قبضہ کا مشہور نہ ہونا کوئی عجیب بات نہیں ہے۔

عجب نہیں کہ صدیقی نے خیال کیا ہو کہ اگر میں نے دعویٰ قبضہ کیا تو خلیفہ اس پر بھی بینہ گواہ طلب کرے گا جس طرح کہ عطیہ کے دعویٰ پر طلب کیا ہے۔ جبکہ خلیفہ کی رفتار صدیقی کی نظر میں ایسی غیر منصفانہ ہے جو کسی حق کے اعتراض پر راضی نہیں۔

اس زمانہ میں تو یہ بھی آسان تھا کہ وکیل فاطمہؑ کو کوئی مچھل نکل جاتی جیسے کہ ابو سعید خدری کو نکل گئی اور انھوں نے حدیث عطیہ کو نہیں بیان کیا اور واقعہ کے چند دنوں اسے ظاہر کر دیا۔ یا کوئی جن قتل کر دیتا جس طرح کہ سعد بن عبادہ کو قتل کر کے اس نے فاروق کو شجاعت دلادی۔ یا پھر ازندا رہی سے متہم کر دیا جاتا یہ کہہ کر کہ یہ صدقہ مسلمین کو روکتا ہے جیسا کہ مانعین زکوٰۃ کو متہم کیا گیا۔

۳ — ہم اس اعتراض کو بھی ترک کیے دیتے ہیں تاکہ ایک نیا دہی سلسلہ شروع کریں اور وہ یہ کہ خلیفہ کو عصمت زہراؑ کا اعتقاد اور یہ تطہیر

جس میں فاطمہؑ شامل ہیں اس پر ایمان تھا یا نہیں؟
 ہم اثبات عصمت کے مسئلے کو طول دینا نہیں چاہتے۔ اس سے تو کتب امامیہ
 بھری ہوئی ہیں جن کا خلیفہ کو بھی علم تھا۔ اس لیے کہ عائشہؓ خود بھی آیہ تطہیر کی راوی ہیں کہ
 وہ حسہ نجیبہ کی شان میں نازل ہوئی۔ اور اس امر کی تصریح صحاح سنت و شیعہ میں ہے کہ
 رسول اللہؐ نزول آیت کے بعد چھ ماہ تک بعد نماز صبح فاطمہؑ کے دروازہ پر آکر اس آیت
 کی تلاوت فرماتے تھے۔

سوال یہ ہے کہ خلیفہ نے فاطمہؑ سے گواہ کیوں طلب کیا؟

کیا یقینی دعویٰ بھی ممکن بنتا ہے؟

ابو ہریرہؓ بعض موثر صفین کا کہنا ہے کہ شاید ظن غالب کے حصول کے لیے بنتیہ
 طلب کیا ہے۔ جبکہ ظاہر ہے کہ علم و یقین ظن سے بہتر ہے۔ اگر حاکم کو مدعی کی صداقت
 کا یقین ہو تو اس کے حق میں فیصلہ دے دینا چاہیے اور پھر بنتیہ طلب کرنا درست نہیں۔
 لیکن میرا خیال ہے کہ یہ اعتراض غیر مناسب ہے۔ اس لیے کہ ان لوگوں نے
 بنتیہ اور علم کو نفس حاکم میں تاثیر کے اعتبار سے مقابل قرار دیا ہے۔ اس لیے فیصلہ کیا ہے
 کہ علم اتویٰ ہے۔ حالانکہ اس کا مقابلہ واقعہ کے اعتبار سے ہونا چاہیے اور اس لحاظ سے دونوں
 برابر ہیں۔ علم بھی خطا کرتا ہے اور بنتیہ بھی۔

البتہ اس مقام پر ایک نکتہ ہے جس سے اکثر حضرات غافل ہو گئے ہیں اور
 وہ یہ کہ صداقت زہراؑ کے متعلق خلیفہ کا علم کبھی خطا نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ وہ ان سبب
 سے نہیں حاصل ہوا جس میں اکثر وہیم و جہل مرکب ہو جاتا ہے۔ بلکہ اس کا مد رک قرآن کریم
 ہے جس سے خطا ظہیر ممکن ہے۔ اس بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ صداقت زہراؑ کا علم غلط نہیں
 ہو سکتا۔ البتہ بنتیہ خطا ہو سکتا ہے اور جب کہ بنتیہ سے حکم واجب ہے تو علم سے تو بہر حال
 واجب ہو گا۔

دوسرے الفاظ میں یوں کہا جائے کہ اگر آیت قرآنی یوں ہوتی کہ فاطمہؑ دعویٰ ملکیتِ فدک و عطیہ میں صادق ہیں تو کسی مسلمان کو مجالِ شک اور کسی اسلامی حاکم کے لیے عملِ تردّد باقی نہیں رہ سکتا تھا۔ تو اسی طرح جب قرآن نے عصمتِ زہراؑ پر نص کر دی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ فاطمہؑ کوئی غلط دعویٰ نہ کریں گی۔

اب جو یہ دعویٰ کریں اس کا قبول کرنا واجب ہوگا۔ ان دونوں قسموں کی نص میں کوئی فرق واضح نہیں ہے، البتہ عبارتی فرق ضرور ہے۔

ہم یوں بھی استدلال کر سکتے ہیں کہ آج تک کسی مسلمان نے صدقِ زہراؑ میں شک نہیں کیا اور نہ کسی نے یہ کہا ہے کہ فاطمہؑ نے اپنے باپ پر افسر کیا ہے۔ صحتِ نزاع اس بات پر تھی کہ آیا فیصلہ کے لیے علم کافی ہے یا پھر گواہیوں کی ضرورت ہے۔

ہم آئیہ تطہیر کو ترک کیے دیتے ہیں لیکن یہ کہتے ہیں کہ جب کہ خلیفہ کو مثل باقی مسلمانوں کے صدقِ زہراؑ کا علم تھا، اگرچہ اس میں وہ خصوصیات نہ رہی ہوں جنہیں ہم نے بیان کیا اور وہ بھی قابلِ خطا و اشتباہ رہی ہوں اور اس اعتبار سے بتیہ سے بہتر یا اس کے مساوی نہ رہی ہوں لیکن کیا حاکم کو اپنے علم کی بنا پر حکم کرنے سے کوئی شے مانع ہے؟ حاکم کے لیے جس طرح جائز ہے کہ اپنے علم کی بنا پر فیصلہ کرے اسی طرح اس کے لیے یہ بھی جائز ہے کہ گواہوں کی بنیاد پر فیصلہ کرے۔

قرآن مجید کہتا ہے کہ حاکم اپنے علم کی بنا پر حکم کر سکتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

«وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ

تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ» (سورہ نساء، آیت ۵۸)

«وَمِمَّنْ خَلَقْنَا أُمَّةً يَهْدُونَ بِالْحَقِّ

وَبِهِ بَعْدَ لُؤُنٍ» (سورہ اعراف، آیت ۱۸۱)

حق و عدل کے دو لحاظ ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ کبھی بات واقعی اعتبار سے حق

ہوتی ہے خواہ اس کے لیے گواہ نہ ہوں اور کبھی قانونی اعتبار سے حق ہوتی ہے خواہ واقعتاً گواہوں نے غلط بیان سے کام لیا۔ اب اس آیت سے مراد اگر پہلے معنی ہیں تو خلیفہ کا فرض تھا کہ وہ حق کو جانتے ہوئے حکم کر دیتے، چاہے کوئی گواہ ہو یا نہ ہو نا۔

اور اگر دوسرے معنی مراد ہیں تو انھیں تردد کا حق حاصل ہے۔ قانون ادب یہ کہتا ہے کہ آیت سے مراد پہلے معنی ہیں۔ اس لیے کہ ہر لفظ سے اس کے اصلی معنی مراد ہوتے ہیں نہ کہ قانونی۔ جیسا کہ دنیا کی ہر زبان میں واضح ہے۔

مثلاً لغت میں مالک اسے کہیں گے کہ جس کے پاس کوئی بلاک ہو، چاہے قانون تسلیم کرے یا نہ کرے، اسے نہیں کہیں گے کہ جسے قانون نے مان لیا ہے چاہے واقعتاً مالک ہو یا نہ ہو۔ یہ اور بات ہے کہ اگر یہ لفظ قانون کے جسٹر میں درج ہو تو وہاں قانونی ہی معنی مراد ہوں گے۔ لیکن یہ بات لغت سے خارج ہے اور اسے اصطلاح کہتے ہیں۔

یہ بھی واضح ہے کہ واقعی حق دعوتِ عمل کا محتاج ہے۔ اس لیے کہ واقعہ اور ہوتا ہے اور قانون اور۔ لیکن قانونی حق کے لیے الگ سے دعوت دینا لغو ہے۔ وہاں تو قانون وضع کر دینا خود ہی دعوتِ عمل ہے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ آیات اعتبارِ علمِ حاکم پر تجویزی دلالت کرتی ہیں اور اس کے بعد خلیفہ کو کسی تردد و تاامل کا حق نہیں ہے۔

اس کے علاوہ یہ کہ صدیق نے فقط دعویٰ پر اعتماد کر کے حکم کیا ہے جیسا کہ بخاری میں ہے کہ

بعد وفات پیغمبر اکرم، علاء بن حضرمی نے ابو بکر کے پاس کچھ مال بھیجا، وہ بولے کہ جس کا نبی پر کوئی قرض ہو یا جس سے انھوں نے کوئی وعدہ کیا ہو وہ آکرے جائے۔ جابر نے کہا مجھ

سے رسولؐ نے حسب ذیل وعدے فرمائے ہیں۔ ابو بکر نے تین مٹھیاں دیں جن میں ہر ایک میں پانچ سو درہم تھے۔

طبقات ابن سعد میں ابو سعید خدری سے روایت ہے وہ کہتے ہیں:

”میں نے مدینہ میں ابو بکر کی منادی سنی، اس وقت

جب کہ مالِ بحرین آیا۔ جس کا رسولؐ سے کوئی وعدہ رہا ہو وہ آئے۔ بہت سے لوگ آئے اور لے گئے، اتنے میں ابو البشیرؓ

آگئے۔ ابو بکر نے کہا: اے ابو البشیر! جب کوئی مال آیا کرے

تو تم بھی آیا کرو اور یہ کہہ کر ایک ہزار چار سو درہم دیے۔“

اب جب کہ خلیفہ نے کسی صحابی سے قرض یا وعدہ رسولؐ پر لینے

(گواہ) نہیں مانگا تو فاطمہؓ سے دعویٰ عطیہ پر بعینہ کا مطالبہ کیوں کیا؟

کیا نظامِ قضاوت صرف فاطمہؓ سے مخصوص تھا؟

یا حالات و سیاسیہ نے فاطمہؓ کو یہ خصوصیت عطا کر دی تھی؟

عجیب بات ہے کہ صحابی رسولؐ کے دعویٰ کو مالِ کثیر میں قبول کر لیا جائے،

اور بعتہ الرسولؐ کا دعویٰ یہ کہہ کر ٹھکرا دیا جائے کہ گواہ موجود نہیں ہے۔

اگر صداقتِ مدعی کا علم فیصلہ کو جائز بنا دیتا ہے تو ظاہر ہے کہ

جس کی نظر میں جابر و ابو البشیر متہم نہیں اس کی نظر میں فاطمہؓ زہراؓ بھی متہم نہیں ہو سکتیں

اگر صحابہ کے عطایا دعویٰ کی قبولیت کی بنا پر نہ تھے بلکہ احتمالِ صدق کی بنا پر اعتیاطاً

دیے گئے تھے تو پھر فدک کے معاملہ میں احتیاط کیوں نہیں کی گئی۔

خلاصہ یہ ہے کہ

ابو بکر کے اس طرز عمل سے وعدہ اور عطیہ کا فرق قیامت تک کے

یہ تشنہ جواب رہ گیا کہ وعدہ میں تو گواہ کی ضرورت نہ ہو اور عطیہ کے لیے معصوم گواہوں

کی گواہی بھی معتبر نہ ٹھہرے۔

اب ہم اپنے اعتراض کو ایک نئی بنیاد پر قائم کرتے ہیں اور وہ یوں کہ ہم اس بات کو تسلیم کیے لیتے ہیں کہ حاکم کو اپنے علم کی بنا پر بغیر گواہ کے حکم کرنے کا کوئی حق نہیں ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صدیق نے خود دعویٰ عطیہ کی گواہی کیوں نہیں دی؟ جبکہ انھیں صداقت زہرا کا علم تھا۔ اگر وہ اپنی گواہی کو علی کی گواہی کے ساتھ ملا دیتے تو نصاب کامل ہو جاتا اور حق ثابت ہو جاتا۔ یہ بھی واضح رہے کہ ان کا حاکم بن جانا ان کی گواہی کو ساقط نہیں کرتا۔ اس لیے کہ اعتبار بتیہ کی دلیلیں غیر حاکم کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں بلکہ انھیں ہر ایک کے لیے عمومیّت حاصل ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ فلیفہ نے واقعہ معلوم کو کیوں ترک کیا؟ اس امر کی وضاحت کے لیے ہم دو باتوں کا فرق واضح کر دینا چاہتے ہیں جن کو اکثر عملہ نے مخلوط کر دیا ہے۔

① — مدعی کے قول کے مطابق حکم کرنا۔

② — واقعی آثار کا نافذ کرنا۔

اگر ہم تسلیم کر لیں کہ پہلا امر گواہی پر موقوف ہے تو دوسرا تو بہر حال واجب ہے اس لیے کہ یہ کوئی حکم یا قانون نہیں ہے کہ اس کے حدود و قیود مقرر کیے جائیں۔ مثلاً اگر کسی کو معلوم ہو جائے کہ میرا مکان دوسرے کا ہے تو مکان اسے دے دینا حکم نہیں کہا جاتا بلکہ اسے واقعی قانون پر عمل کہا جاتا ہے۔ جس طرح سے اگر کوئی شخص خود

نے اس مسئلہ کی ایک واضح مثال روایت لہاں ہے، اس لیے کہ کبھی حاکم شرع رویت کا حکم کرتا ہے تو پہلے تو اس کے لیے قانون ثبوت کی ضرورت ہے تو پھر اس کی مخالفت ناجائز ہے لیکن کبھی یہ کہتا ہے کہ میری نظر (باقی اگلے صفحہ پر)

حاکم پر کوئی دعویٰ کرے یا کسی طرح ثابت کر دے کہ تمہارا مکان میرا ہے تو حاکم کو اسے دے دینا چاہیے اور یہ قضاوت نہیں ہے بلکہ یہ بات بلا حاکم و حکم کے بھی ثابت ہے۔ اس لیے کہ قبضہ وغیرہ دلیل قضاوت نہیں ہیں۔ بلکہ آثار ملکیت میں ہیں۔ اور آثار دانتی کو پیش نظر رکھنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔

اگر حاکم کسی شخص کے لیے کسی مکان کی ملکیت کا حکم کرے یا یہ کہ مکان پر آثار ملکیت مرتب کرے تو ان دونوں باتوں کا فرق یہ ہوگا کہ قضاوت قطع نزاع ہے اگر حاکم نے کوئی فیصلہ کر دیا تو اب تمام مسلمانوں کے لیے اس کا نفی کرنا حرام ہے اور سب پر اس کے آثار مرتب کرنا واجب ہے جس کی دلیل صرف حکم حاکم ہے۔ اور کسی شے کی ضرورت نہیں ہے۔ بر خلاف "تطبیق آثار ملکیت" اس لیے کہ یہ قائمی کا شخصی فعل ہے اس کا اتباع لازم نہیں ہے بلکہ ہر شخص اپنے علم کے مطابق اس شے سے معاملہ کرے گا۔

نتیجہ کلام یہ ہے کہ

جب خلیفہ کو فاطمہ کی ملکیت کا علم تھا تو انھیں فدک میں کسی قسم کے تصرف کا حق نہ تھا۔ خواہ حکم کرنا ان کے لیے جائز ہو یا نہ ہو۔ پھر جب کہ اس واقعہ میں ان کے علاوہ کوئی اور منکر بھی نہیں تھا کہ جس سے قسم لے کر اسے مال دے دیا جاتا۔ اس لیے کہ جن اموال کی فاطمہ مدعی تھیں یا تو وہ مال ان کا تھا یا مسلمانوں کا۔ اور فرض یہ ہے کہ ابو بکر خلیفہ مسلمان تھے، لہذا یہ ولی مسلمان بھی تھے۔ اور ان کا فرض تھا کہ ان کے حقوق کا تحفظ کرتے۔

(گزشتہ سے پوستہ :-)

میں روایت ثابت ہے تو ایسے وقت خود کے لیے عمل واجب ہے۔ اگرچہ دوسروں پر کوئی قانون نافذ نہیں کیا گیا معلوم ہو کہ قانون سے یہ ثابت ہوتا اور ہے اور اپنے علم پر عمل کرنا اور۔ (مترجم)

اگر فاطمہؑ اپنے دعویٰ میں سچی تھیں اور مسلمانوں میں ان کا کوئی مخالفت نہیں تھا تو ان سے سلب و غضب کرنا ناجائز تھا۔ گواہ کا نہ ہونا فیصلہ کو حرام بناتا ہے نہ کہ غضب کو جائز و حلال۔
خلاصہ یہ ہوا کہ

اپنے ذاتی علم کی بنا پر حکم نہ کر سکتا خلیفہ کے محاسبہ کو خفیہ نہیں بنا سکتا۔ اس لیے کہ معاملہ دو غیر آدمیوں کے درمیان نہیں تھا کہ بغیر گواہ کے حکم نہ ہوتا بلکہ وہ مال پر خود ہی قابض تھے لہذا ان کا فریضہ تھا کہ اپنے علم کی بنا پر مال فاطمہؑ زہرا کے حوالے کر دیتے اور خود غضب کی عقوبت سے محفوظ ہو جاتے۔ ایسی صورت حال میں تو قصاوت اور فیصلہ کی بھی ضرورت نہ تھی کہ جہاں گواہ و بیٹہ تلاش کیا جاتا۔

وَأُخِرَ دَعْوَانَا انْ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ



فلسوف شرق حضرت آیت اللہ العظمیٰ شہید سید محمد باقر الصدر کی مایہ ناز اور گرانقدر تالیفات

